اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

جون ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

# ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

## عصری تعلیم کی اصلاح

| | قیمت |
|---|---|
| ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل | ۶۰۰ |
| اسلامی سکول کے خدوخال | ۱۵۰ |
| تعلیم اور اس کا اسلامی کردار | ۳۰۰ |
| یکساں قومی نصاب۔خدشات ومضمرات | ۲۵۰ |
| تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ) | ۵۰ |
| تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ) | ۵۰ |
| پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ) | ۵۰ |
| ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرِطبع) | |

## طلبہ کی اسلامی تربیت

| | |
|---|---|
| تعلیمی ادارے اور کردار سازی | ۲۵۰ |
| تعلیمی اداروں میں تعمیرِ سیرت۔ہینڈ بک وگائیڈ | ۳۰۰ |

## اصلاحِ دینی مدارس

| | |
|---|---|
| ہمارا دینی نظامِ تعلیم | ۴۵۰ |
| نصابِ مدنیؒ | ۸۰ |
| مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ وتجزیہ | ۲۵۰ |
| اصلاحِ دینی مدارس | ۴۰۰ |

## اسلامی تحریکیں

| | |
|---|---|
| پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟ | ۳۰۰ |

| | قیمت |
|---|---|
| ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ) | ۴۰ |
| خاموش انقلاب ناگزیر ہے | ۲۵۰ |
| عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور | ۱۵۰ |

## تزکیۂ نفس

| | |
|---|---|
| اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ) | ۱۵۰۰ |
| حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً) | ۸۰ |
| اپنی اصلاح آپ کیسے؟ | ۸۰ |
| ترکِ رذائل (احمد جاوید) | ۳۵۰ |
| اسلام اور تعمیرِ سیرت (زیرِطبع) | |

## مغربی فکر وتہذیب

| | |
|---|---|
| اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش | ۳۵۰ |
| اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ | ۲۵۰ |
| اسلام اور ردِّ مغرب | ۳۰۰ |

## فہم دین

| | |
|---|---|
| مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل | ۴۷۵ |
| مقالاتِ امین (جلد اوّل) | ۱۰۰۰ |
| مقالاتِ امین (جلد دوم) | ۱۰۰۰ |
| شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت | ۵۰ |

## مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

# فہرست کتب

## ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اور ان کا حلقۂ فکر

* سرمایہ دارانہ نظام ایک تعارف: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* جمہوریت یا اسلام: زاہد صدیق، وہاب سوری، جاوید اقبال، امین اشعر، ڈاکٹر جاوید، ذیشان ارشد
* سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ: زاہد صدیق، وہاب سوری، جاوید اقبال، ڈاکٹر جاوید
* سرمایہ دارانہ عقائد ونظریات: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* انقلابی عمل۔ایک اسلامی تجزیہ: زاہد صدیق، وہاب سوری، جاوید اقبال، امین اشعر، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* تصوف اور تحریک اسلامی کے کارکنان: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* سوشل سائنسز، جمہوریت اور اسلامی بنکاری کا فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ: زاہد صدیق مغل
* اسلام اور جدید سائنس۔نئے تناظر میں: محمد ظفر اقبال
* جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب اور احیاء کے تقاضے: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* تحریک لال مسجد۔ایک انقلابی عمل: جاوید اقبال، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، یونس قادری
* اسلامی تمویلی نظام۔اسلامی بنکاری کا متبادل: یونس قادری
* سرمایہ داری کے نقیب: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* اصلاح، انقلاب اور اسلامی گروہوں کی معاصرانہ جدوجہد: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* سرمایہ دارانہ نظام ایک تعارف (برائے طلبہ مدارس): ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* مقالاتِ تفہیمِ مغرب۔کلامیات وعلمیات: ڈاکٹر زاہد صدیق مغل
* Capitalist Values and Ideologies-An Islamic Approach: Dr.Javed Akbar Ansari
* Rejecting Freedom and Progress: Dr. Javed Akbar Ansari

رابطہ برائے خرید کتب: امین اشعر 0333-2122756

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۶، جون ۲۰۲۱ء/شوال ۱۴۴۲ھ


## مشمولات


O بیت المقدس/اقصٰی

کہاں ہو تم؟ ڈاکٹر سیف اللہ فیضی ۴

O تعلیم و تربیت

- سپریم کورٹ کیس: تعلیم پر اقلیتوں کے اعتراضات کا جائزہ، تجاویز اور سفارشات پروفیسر ملک محمد حسین ۶

- تعلیم میں مسابقت کا شیطانی کھیل سید خالد جامعی ۱۸

O دینی مدارس

- حقیقی تعلیمی مسائل سے حکومت اور علماء کی غفلت ڈاکٹر محمد امین ۲۰

- 'مجمع العلوم الاسلامیہ' کی حمایت کا اعلان ۲۴

O تفہیم اسلام

- اقامت دین اور غلبۂ دین کی بحث مدیر ۳۰

O یادِ رفتگان

- مولانا وحید الدین خاںؒ - حاصل جدوجہد محمد دین جوہر ۳۳

- مولانا وحید الدین خاںؒ پر شاہنواز فاروقی کی ناروا تنقید مدیر ۳۴

O عالم اسلام

سانحہ بیت المقدس اور سیکولر مسلم حکمران اوریا مقبول جان ۳۶

O میں نے زندگی سے کیا سیکھا؟

کرونا کی تکلیف و تجربات مدیر ۳۹

O تفہیم مغرب

مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار و آراء ایک مختصر مگر جامع تجزیہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۴۷



مدیر: ڈاکٹر محمد امین

نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے

سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے

تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

A/c # 02011478219

برائے رابطہ

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700

ادارتی امور

ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

بیت المقدس/اقصیٰ

ڈاکٹر سیف اللہ فیضی[1]

# کہاں ہو تم؟

کہاں ہو تم؟
نظر اٹھاؤ، ادھر بھی دیکھو
بپا ہے چاروں طرف قیامت
تمہیں ضرورت تھی اس خبر کی
تو سن لو تازہ خبر ہے حاضر!
غلیظ پاؤں
ان دندناتے نجس لعینوں کے صحنِ مقدس میں آ چکے ہیں
وفا شعارو کہاں ہو تم؟
او حوضِ کوثر پہ شافعِ محشر کے پاک ہاتھوں سے جام پینے کی جستجو میں تڑپنے والو!
وفا کی باتیں وفا کے دعوے کہاں گئے ہیں؟
وفا شعارو کہاں ہو تم؟
کہ خونِ مسلم پہ متحد ہیں تمام قومیں
چالاک
شاطر
عیار قومیں
سبھی سمجھتے ہیں یہ حقیقت
مگر یہ ساری عیار قومیں خونِ مسلم پہ متحد ہیں

[1] پروفیسر علوم اسلامیہ سول لائیز کالج، لاہور

وفا شعارو!
کوئی گلہ ہے نہ کوئی شکوہ
پھول بچوں عفیف بہنوں کی عفتوں کے
اے پاسبانو!
ارے فلسطیں کی خون آشام صبحیں تم کو پکارتی ہیں
مرا چراغِ امید تم ہو، کچھ تو بولو کہ تم کہاں ہو؟
ارے عرب سوا ارب کہاں ہو تم ؟
امن کی دھرتی پہ جینے والو
ان حکمرانوں کی بے حسی کا روز ماتم منانے والو!
یہاں وہاں سب جانتے ہیں کہ تم ہو بے بس
او بے بسو!
بس اتنا کر دو
ہمارے غم میں جو تم نے بدلا
وہ ایک پہلو
ہماری خاطر دعا میں نکلا
وہ ایک آنسو
دکھا سکو گے؟
جو تم نے بدلا ہمارے غم میں
وہ ایک پہلو دکھا سکو گے؟
کہ اس پہ تلوار کوئی پہرہ نہیں لگا ہے
ارے عرب سوا ارب!
وہ ایک آنسو دکھا سکو گے؟
یاں قریہ قریہ ہیں قتل گاہیں
قدم قدم پہ ہیں مذبح خانے
وہ ایک مومن جو رب کے گھر سے بھی قیمتی تھا
غزہ کی مٹی کا ذرہ ذرہ اسی کے خوں سے تر بتر ہے
ارے عرب سوا ارب
تونگری کی ہو تم علامت
تمہاری دولت کی شہرتیں ہیں
نظر اٹھاؤ کہ جسدِ مسلم ہر روز ٹکڑوں میں بٹ رہا ہے
جو کچھ نہیں تو
خرید ہی لو
متاع پڑی ہے یہ بیش قیمت
یہ جتنی اب ہے پھر اتنی ارزاں نہیں ملے گی
ارے عرب سوا ارب
جو کچھ نہیں تو خرید ہی لو
یہ جتنی اب ہے پھر اتنی ارزاں کہاں ملے گی
ارے عرب سوا ارب!
کہاں ہو تم ؟
کہاں ہو تم ؟

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

سپریم کورٹ میں زیر سماعت کیس

# نصابِ تعلیم اور درسی کتب پر اقلیتوں کے اعتراضات

## جائزہ، تجاویز اور سفارشات

۲۰۱۳ء میں پشاور کے چرچ پر دہشت گردوں کے حملہ کے بعد اس وقت کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے سوموٹو ایکشن لیتے ہوئے ۱۹ جون ۲۰۱۴ء کو فیصلہ صادر فرمایا۔ اس فیصلہ میں تعلیم کے متعلق بھی ایک شق تھی جو حسب ذیل ہے:

Appropriate curricula be developed at school and college level to promote culture of religious and social tolerance.

بعدازاں ۲۰۱۷ء اور ۲۰۱۸ء میں ہیومن رائٹس کمیشن کے ڈاکٹر مہدی حسن، سنٹر فار سوشل جسٹس کے سربراہ پیٹر جیکب نے اور عیسائی اقلیتی گروپ کی ایک اور این جی او نے سپریم کورٹ میں استدعا داخل کی جس میں جون ۲۰۱۴ء کے فیصلوں پر عمل درآمد پر زور دینے کو کہا گیا۔ اس پر سپریم کورٹ نے یک رکنی شعیب سڈل کمیشن قائم کیا کہ وہ جائزہ و تحقیق کے بعد بتائے کہ فیصلوں پر عمل درآمد کی صورتِ حال کیا ہے؟ ایک قابل توجہ بات یہ ہوئی کہ فاضل سپریم کورٹ نے پٹیشنرز (Petitioners) کو ہی مذکورہ کمیشن کا مشیر بھی مقرر کر دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیران گرامی قدر نے وزارت وفاقی تعلیم کی تیار کی جانے والی حالیہ ماڈل ٹیکسٹ بکس کو جو سنگل کریکولم کے تحت لکھی گئی ہیں لفظاً لفظاً پڑھ کر اپنے اعتراضات کی فہرست یک رکنی کمیشن کو تھما دی اور یک رکنی کمیشن نے نصاب تعلیم کے ضمن میں عمل درآمد کی رپورٹ سپریم کورٹ میں جمع کرا دی۔ اعتراض یہ کیا گیا کہ اسلامی مواد اُردو، انگریزی اور معاشرتی علوم کے لازمی مضامین میں ڈالا گیا ہے۔ لازمی مضامین کی یہ کتب چونکہ غیر مسلم طلبہ نے بھی پڑھنی ہیں اس لیے اس سے دستور کے آرٹیکل 22 کی خلاف ورزی ہوتی ہے جس کے مطابق کسی طالب علم کو اس کے مذہب کے علاوہ دوسرے کسی مذہب کی تعلیمات کے پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہاں پر مندرجہ ذیل تین سوالات اُٹھتے ہیں جن کا معروضی جائزہ لینا ضروری ہے:

1۔ جون ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ کا جو نصاب تعلیم کے متعلق فیصلہ تھا کیا اقلیتی کمیشن نے اس کے مطابق یہ سفارشات اور اعتراضات داخل کیے ہیں یا فیصلہ کچھ اور تھا اور اب اعتراضات کچھ اور کیے جا رہے ہیں؟

2۔ ماڈل درسی کتب میں جس تدریسی مواد پر اعتراض کیا جا رہا ہے کیا وہ دین اسلام کے متعلق ہے یا یہ تدریسی مواد مسلمانوں کی تاریخ، مسلمانوں کے رول ماڈل ہیروز، مسلمانوں کی معاشرتی روایات اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کے متعلق ہیں؟

3۔ کیا ملک کی چھوٹی سی اقلیت کے مقابلے میں ملکی آبادی کی ۹۷ فیصد مسلم اکثریت کے بچوں کو ان کی تعلیمی ضروریات اور روایات سے محروم رکھا جا سکتا ہے جبکہ یہ تعلیمی ضروریات اور روایات بھی دستور کے آرٹیکل 31 اور مسلمان بچوں کے بنیادی حقوق کا تقاضا ہیں؟

اب ہم تینوں سوالات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں:

سوال نمبر ا: سپریم کورٹ نے جون ۲۰۱۴ء میں یہ حکم دیا تھا کہ سکول اور کالج کی سطح پر ایسا نصابِ تعلیم ترتیب دیا جائے جس سے مذہبی اور سماجی برداشت کا کلچر پروان چڑھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس حکم کے الفاظ اور روح کی طرف سرے سے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سنگل نیشنل کریکولم کی سماجی اور مذہبی برداشت پیدا کرنے کے حوالے سے اقلیتوں کا سرے سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ البتہ مسلم اکثریت کے صاحب علم خواتین وحضرات کو یہ اعتراض ضرور ہے کہ سنگل نیشنل کریکولیم کو کچھ زیادہ ہی سیکولرائیز کر دیا گیا ہے اور اس نصاب میں اسلامی اقدار مکمل طور پر نظرانداز کر دی گئی ہیں۔

سوال نمبر ۲: سنگل نیشنل کریکولم کے تحت تیار کی جانے والی ماڈل درسی کتب پر یہ اعتراض کہ اسلامیات کا مواد اردو، انگریزی اور معاشرتی علوم کی درسی کتب میں شامل کر دیا گیا ہے جو کہ صرف اسلامیات کی درسی کتب میں ہونا چاہیے تا کہ غیر مسلم اقلیتوں کے بچوں کو ان کی مرضی کے بر خلاف یہ مواد نہ پڑھنا پڑے۔

اس اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی درسی کتاب میں اسلامیات کا مواد سرے سے نہیں ہے۔ اسلامیات کے مواد سے مراد ہے کہ اسلام کے عقائد، اسلام کی عبادات، فرد پر عائد اسلام کے فرائض، اور فقہی احکامات وغیرہ۔ اس طرح کا کوئی مواد کسی بھی درسی کتاب میں موجود نہیں

ہے۔ حمد اور نعت رسول ﷺ بطور رول ماڈل تو پوری انسانیت کی میراث ہیں۔ بعض خلفائے راشدین اور مسلم خواتین بطور رول ماڈل دیے گئے ہیں جن کی زندگیاں پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ماضی کے مقابلے میں اس طرح کا مواد بھی ماڈل درسی کتب میں بہت کم کر دیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرت کے ہیروز کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ غیر مسلم اقلیتی راہنماؤں کو صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد، محمود غزنوی، سلطان ٹیپو اور اسی طرح کے عظیم اسلامی راہنماؤں سے چڑ ہے اور یہ لوگ ان عظیم ہستیوں کو درسی کتب سے نکلوانے کی جد و جہد کرتے رہے ہیں۔ معاشرتی علوم کی کتب جن میں مسلمانوں کے معاشرے کی باتیں ہونا چاہئیں تھیں بالکل سیکولر کر دی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں نظریۂ پاکستان، دوقومی نظریہ اور اسلامی معاشرے کے خدوخال ناپید ہیں۔

سوال نمبر ۳: پاکستان مسلم اکثریت کا ایک جمہوری ملک ہے جس میں 97 فیصد مسلمان اور صرف تین فیصد غیر مسلم ہیں۔ ان تین فیصد میں بھی ایک فیصد قادیانی ہیں جو اگرچہ غیر مسلم شمار ہوتے ہیں لیکن ان کے عقائد کے مطابق انہیں درسی کتب میں اسلامی مواد شامل کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ سکھ بھی اگر کہیں ہیں تو ان کی طرف سے بھی کوئی اعتراض نہیں آیا۔ صرف شاید عیسائی اور ہندو اقلیت کے بعض خودساختہ راہنما مغرب سے فنڈنگ لینے کی وجہ سے ان کو خوش کرنے کے لیے آواز اُٹھاتے ہیں۔ اقلیتوں کی اگر پسند ناپسند کو دیکھنا ہو تو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر جہاں اسلامیات کے متبادل کے طور پر اخلاقیات Ethics کا مضمون موجود ہے، اقلیتی طلبہ اسلامیات کو اختیار کرتے ہیں اور اکثر مسلم طلبا سے زیادہ نمبر لیتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر کیا یہ قرین انصاف ہے کہ غیر مسلم آبادی کے بچوں کو اسلام اور اسلامیات نہ پڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ جس طرح کسی غیر مسلم طالب علم کو اسلامی مواد پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کسی مسلم طالب علم کو اسلامی مواد نہ پڑھنے پر بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ زیادہ سے زیادہ 5 فیصد تعلیمی ادارے ایسے ہوں گے جن میں اکا دُکا غیر مسلم طلبا نظر آتے ہیں کیا یہ انصاف ہوگا کہ 95 فیصد تعلیمی اداروں کے سو فیصد طلبہ اور ۵ فیصد اداروں کے ۹۸ طلبہ جو مسلمان ہیں ان کو ان کی دینی، معاشرتی اور تاریخی روایات کا علم حاصل کرنے سے محروم کر دیا جائے۔

## پاکستان میں تعلیمی نصاب اور درسی کتب کے قومی اور بین الاقوامی تقاضے

پاکستان ایک اسلامی جمہوری ملک ہے جس کا اپنا ایک دستور ہے اور جس کے دستور میں تعلیم

وتربیت سے متعلق واضح احکامات دیے گئے ہیں۔ نیز پاکستان بعض بین الاقوامی ڈیکلریشنز اور کنونشنز کا دستخط کنندہ بھی ہے جو بچوں کی تعلیم سے متعلق ہیں۔ سب سے پہلے ہم پاکستان کے دستوری تقاضوں کی بات کرتے ہیں:

" آئین میں شامل قراردادِ مقاصد اور آئین کا آرٹیکل 31 ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں جیسا کہ قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے نیز انہیں قرآن کی لازمی تعلیم دی جائے۔"

اب دستور کا یہ تقاضا تعلیم کے ذریعے پورا ہوگا۔ تعلیم کا وہ آلہ (Instrument) جو اس مقصد کی تکمیل کرتا ہے وہ ہے تعلیمی نصاب۔ درسی کتب تعلیمی نصاب کا مظہر ہیں جبکہ نصاب تعلیم کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہ تمام رسمی اور غیر رسمی سرگرمیاں تشکیل دی جاتی ہیں جو اس مقصد کے لے ضروری ہوتی ہیں اور صراحت کے ساتھ ان کا تعین کیا جاتا ہے۔

یہ سرگرمیاں حسب ذیل ہیں:

مارننگ اسمبلی، بزم ادب، سٹوڈنٹس سوسائٹیز، تقریری وتحریری مقابلے، نعت خوانی اور قرأت کے مقابلے، کھیلیں، تعلیمی سیریں، تعلیمی ادارے کی ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں.... گویا وہ تمام سرگرمیاں جو تعلیمی ادارے کے اندر یا باہر رسمی طور پر یا غیر رسمی طور پر منعقد کی جاتی ہیں وہ نصاب کے مقاصد اور تقاضوں کو پورا کرنے کی پابند ہیں۔ اب ہم اگر قرارداد مقاصد اور آئین کے آرٹیکل 31 کو پیشِ نظر رکھیں تو درسی کتابوں کے علاوہ تعلیمی اداروں کی باقی سرگرمیاں بھی اسلامی تعلیمات، اسلامی اخلاقیات، اسلامی روایات، اسلامی ثقافت اور اسلامی اقدار کی آئینہ دار ہونی چاہئیں۔

## دستور کی شق A-25 کا تقاضا

پاکستان کے دستور کی شق A-25 کا تقاضا ہے کہ 5 سال سے 16 سال کی عمر تک تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ ۱۶ سال کی عمر کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس کے مطابق کافی مقدار میں بچے تعلیم چھوڑ کر عملی زندگی میں گم ہو جاتے ہیں۔ اب اگر آرٹیکل 31 اور آرٹیکل A-25 کو یکجا کر کے پڑھا جائے تو تعلیم کا اہم ترین تقاضا یہ بنتا ہے کہ ۱۶ سال کی عمر تک جو تعلیم دی جائے اس کے نتیجے میں طالب علم اسلام کے مکمل تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔ اس سے نصاب کا

تقاضا یہ نکلتا ہے کہ:

۱۔ مکمل اسلامی زندگی گزارنے کے لیے ان لازمی اسلامی معلومات کی فہرست بنائی جائے جو اس مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

۲۔ ان عادات، اخلاقیات، رویوں، مہارتوں اور اعمال کی فہرست بنائی جائے جو اسلامی زندگی کی آئینہ دار ہوں۔

۳۔ درج بالا کی تدریجی فہرست ہو اور پھر اس فہرست کو بچوں کی ذہنی سطح اور عمر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی سے دسویں جماعت کے نصابی خاکوں میں ڈھال دیا جائے۔ اس طرح جو مواد سامنے آئے گا وہ پہلی سے دسویں جماعت تک اسلامیات کا نصاب ہوگا۔

۴۔ اس نصاب کو درسی کتب اور نصابی، ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں شامل کرلیا جائے۔

دستور کی روشنی میں یہ جن تقاضوں اور ان کی نصابی تفصیلات کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کی روشنی میں نصاب تعلیم کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ موجودہ حکومت کے اختیار کردہ سنگل نیشنل کریکولم کا اگر جائزہ لیا جائے تو سخت مایوسی ہوتی ہے کہ نہ طریق کار درست اختیار کیا گیا اور نہ ہی نصاب تعلیم کا لوازمہ ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسلامیات کا نصاب نا کافی ہے۔ دیگر مضامین خصوصاً انگریزی، معاشرتی علوم، جنرل نالج، سائنس اور ریاضی کا نصاب مکمل طور پر سیکولر ہے۔ معاشرتی علوم اور سائنس کے نصاب پر خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔ سائنس کے نصاب کے ذریعے معرفتِ خداوندی کا حصول اور رب کائنات کے ساتھ طلبا کے تعلق کو جوڑنا انتہائی آسان ہے جس کا وسیلہ سائنس کی درسی کتب ہوتی ہیں کہ جہاں جہاں سائنس کے محیر العقول اصولوں اور مظاہر کا ذکر کیا جائے وہاں ان مظاہر کو اللہ رب العزت کی خالق، مالک اور قانونِ فطرت دینے والے کی حیثیت سے تعارف کرایا جائے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید ریاضی کی درسی کتب میں اسلام کا گزر نہیں ہو سکتا حالانکہ ریاضی کے سوالات میں جمع تفریق ہو یا ضرب تقسیم، ہر قسم کے عبارتی سوالات میں اسلامی عکس دیا جا سکتا ہے۔ اوسط کے سوالات میں، فیصد کے سوالات میں، رقبے نکالنے کے سوالات میں غرض ہر قسم کے سوالات میں اسلامی ماحول دیا جاسکتا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم مثالیں نہیں دے رہے۔ اوپر دی گئی معروضات کی روشنی میں جب ماڈل ٹیکسٹ بکس کا جائزہ لیتے ہیں تو اسلامی تہذیبی نقطہ نگاہ کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے کجا یہ کہ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ

کے مطابق درسی کتب میں اسلامی موادزیادہ مقدار میں دیا گیا ہے۔

### اقلیتوں کے متعلق دستور کا آرٹیکل 22

دستور میں بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ کسی مذہب کے طلبہ کو ان کے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی تعلیمات پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ہم اقلیتوں کے اس حق کی تائید کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے اس حق کا احترام کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہوا کثریتی طلبہ کے حق کی پاسداری کرتے ہوئے اقلیتی طلبہ کا تعلیمی حق بھی پورا کیا جائے۔اس کے لیے علیحدہ نصاب بنانا پڑے،علیحدہ کتابیں تیار کرنا پڑیں حتیٰ کہ علیحدہ تعلیمی ادارے بنانا پڑیں تو حکومت اپنی مالیات سے اقلیتوں کی ان ضروریات کو پورا کرے لیکن اس کی بھی اجازت دی جائے کہ اگر اقلیتی طلبہ اور ان کے والدین پر برضا ورغبت بین المذاہب ہم آہنگی کی خاطر اور مسلم اکثریتی ماحول میں رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کی خاطر نیز اسلامی معاشرے میں ہر قسم کی ملازمت کے حصول اور ملازمت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر اسلامیات، اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کا مطالعہ کرنا چاہیں تو اُن پر قدغن بھی نہ لگائی جائے۔موجودہ حکومت نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ دیگر مذاہب کی مذہبی تعلیم کے لیے علیحدہ نصاب اور درسی کتب تیار کر دی ہیں۔پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر خدمات دینے کی کئی مثالیں ہیں کہ غیر مسلم اہل کاروں نے اپنے فرائض منصبی سے انصاف کیا وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات حاصل کی تھیں اور اسلامی معاشرے کی ضروریات کا فہم رکھتے تھے۔اس سلسلہ میں جسٹس اے آر کارنیلس اور جسٹس بھگوان داس کی روشن مثالیں موجود ہیں۔

### بین الاقوامی ذمہ داری

اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے اعلان کے آرٹیکل 5.2 کے مطابق

"Every child shall enjoy the right to access to education in the matter of religious belief in accordance with the wishes of his parents, or as the case may be, legal guardians, and shall not be compelled to receive teaching on religion or belif against the wishes of his parents or legal guardians the best interest of the child being the guideing principle".

### اسی طرح بچوں کے حقوق کے کنونشن کے آرٹیکل 29-c کے مطابق

"The development of respect for the child's parents, his or her own cultural indentity, languag and values, for the national values of the country in which the child is living, the country form which he or she may originate and for civilization different from his or her own".

اوپر دیے گئے بیانات میں عالمی سطح پر بھی یہ مانا گیا ہے کہ بچے کی تعلیم کے سلسلہ میں اس کے والدین کی خواہشات کا خیال رکھا جائے گا۔ اس کی زبان اور کلچر کا بھی تعلیم میں خیال رکھا جائے گا۔ پاکستان میں بھی اکثریتی مسلمان والدین اور اقلیتی مذاہب کے والدین کی خواہشات کا خیال رکھا جائے یعنی مسلمان بچوں کا نصاب اور درسی کتب اسلامی نظریۂ حیات، اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کی علم دار ہوں نیز اقلیتی بچوں کے والدین کی مذہبی اور ثقافتی پسند ناپسند کا بھی اُسی طرح خیال رکھا جائے۔

### دستور کے آرٹیکل 31 کے تقاضوں کے مطابق تعلیم وتدریس کے ذریعے اسلامی اقدار کا فروغ

دستور کا آرٹیکل 31 ریاست کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو قرآن وسنت کی روشنی میں اسلام کے مطابق زندگی گزارے کے قابل بنائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی اقدار نصاب و کتاب کا حصہ ہوں نیز تعلیمی ادارے کی باقی رسمی اور غیر رسمی سرگرمیاں بھی اسلامی اقدار کی آئینہ دار ہوں اور ایسا نظام وضع کیا جائے کہ اسلامی اقدار طلبہ کی روزمرہ عادات کی شکل اختیار کر لیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اقدار کی ایک جامع فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ ہم یہاں پر اسلامی اقدار کا کم از کم خاکہ پیش کرتے ہیں جن کو نصاب تعلیم اور درسی کتب کے لوازمہ میں ایک جامع تانے بانے کے طور پر سمویا جائے جس کا اس وقت موجودہ درسی کتب میں فقدان ہے۔

### مطلوب اسلامی اقدار کی کم از کم فہرست

پانچ آفاقی اقدار:

۱۔ حرمتِ عقیدہ (دین)　۲۔ حرمتِ جان　۳۔ حرمتِ عقل

۴۔ حرمتِ آبرو (نسل)　۵۔ حرمتِ مال

### اقدار کی تفصیلی فہرست

| | |
|---|---|
| ۱۔ امن بمقابلہ فتنہ | ۲۔ عدل بمقابلہ ظلم |
| ۳۔ حلال بمقابلہ حرام | ۴۔ معافی بمقابلہ انتقام |
| ۵۔ محبت بمقابلہ بغض وعناد | ۶۔ جذبۂ ایثار بمقابلہ خودغرضی |
| ۷۔ قناعت بمقابلہ حرص | ۸۔ کفایت شعاری بمقابلہ اسراف وضیاع |
| ۹۔ یکساں سلوک بمقابلہ امتیازی سلوک | ۱۰۔ شورائیت بمقابلہ آمریت |
| ۱۱۔ عاجزی بمقابلہ تکبر | ۱۲۔ صاف ستھرا ماحول بمقابلہ پولوشن وگندگی |
| ۱۳۔ اجتہاد بمقابلہ جمود | ۱۴۔ آفاقیت بمقابلہ قومیت اور مقامیت |
| ۱۵۔ تدبیر، تفکر، تعقل بمقابلہ اندھی تقلید | ۱۶۔ رواداری بمقابلہ تعصب وتنگ نظری |
| ۱۷۔ صداقت بمقابلہ کذب | ۱۸۔ انفاق فی سبیل اللہ بمقابلہ بخل وکنجوسی |
| ۱۹۔ امانت ودیانت بمقابلہ حق تلفی | ۲۰۔ عدل اجتماعی بمقابلہ سرمایہ پرستی |
| ۲۱۔ مذہب، رنگ، نسل اور علاقہ کی بنیاد پر تنوع کا احترام | |

آرٹیکل 31 کے تحت قرآن حکیم کی تدریس تمام مسلمانوں کے لے لازم قرار دی گئی ہے اور اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی بھی ہوئی ہے۔ نصاب تعلیم میں قرآن کی تدریس لازمی مضمون کی شکل میں شامل کی گئی ہے لیکن تعلیمی اداروں میں نیز نظم الاوقات میں اس کے نفاذ کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عدالت عظمیٰ اس سلسلہ میں حکومت کو واضح ہدایات جاری کرے اور ان ہدایات کی تنفیذ پر مسلسل عدالتی نظر رکھی جائے۔

### سپریم کورٹ کی خدمت میں سفارشات وتجاویز

۱۔ سپریم کورٹ کی طرف سے مقرر کردہ یک رکنی کمیشن جو ڈاکٹر شعیب سڈل پر مشتمل تھا وہ اپنی تمام تر مہارت اور قابلیت کے باوجود تعلیم، نصاب تعلیم اور درسی کتب کے معاملے میں نان ٹیکنیکل پرسن ہے۔ پھر اس کی مدد اور معاونت کے لیے ثاقب جیلانی اور پیٹر جیکب کا تقرر کیا گیا جبکہ دونوں اشخاص پٹیشنر ز (Petitioners) بھی ہیں۔ پیٹر جیکب سنٹر فار سوشل جسٹس کا

صدر ہے جو مبینہ طور پر مغربی ملکوں سے فنڈنگ پر چلتی ہے۔ پیٹر جیکب نصاب تیار کرنے والی نیشنل کریکولیم کونسل کا ممبر بھی ہے اور اس کونسل نے اتفاق رائے سے سنگل نیشنل کریکولیم منظور کیا نیز درسی کتب کی ریویو کمیٹیوں میں بھی پیٹر جیکب اور اس کی لابی کے اقلیتی اراکین شامل ہیں۔ اس ساری صورت حال کے پیش نظر یک رکنی کمیشن اپنے معاونین کی وجہ سے کیسے ایک معروضی رپورٹ پیش کر سکتے تھے؟ یہی وجہ ہے کہ یک رکنی کمیشن کی درسی کتب کے حوالے سے رپورٹ انتہائی تعصب پر مبنی اور یک طرفہ ہے۔ حد یہ ہے کہ جس کسی صفحہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام یا کسی اور اسلامی رول ماڈل کا نام آیا ہے اس صفحہ پر انہوں نے اعتراض فرما دیا۔ سپریم کورٹ کے فاضل ججوں سے استدعا ہے کہ یہ جانبدارانہ، تعصب پر مبنی غیر حقیقی رپورٹ مسترد کی جائے اور اسے کسی قسم کے عمل درآمد کے قابل نہ سمجھا جائے۔

۲۔ وزارت وفاقی تعلیم نے سنگل نیشنل کریکولم تیار کرنے کے لیے اور منظور کرنے کے لیے جو نیشنل کریکولم کونسل بنائی وہ غیر متوازن، غیر نمائندہ اور معروف سیکولر لبرل قوتوں پر مبنی ہے۔ ''اتحاد تنظیمات دینی مدارس'' کے پانچ نمائندوں کو شامل ضرور کیا گیا لیکن اسلامیات کے علاوہ دیگر مضامین کے نصاب کی تیاری میں ان کو شامل مشاورت نہیں کیا گیا۔ جو نصاب تیار کرنے کا دعوٰی کیا گیا ہے وہ درحقیقت 2006ء کے نصاب تعلیم کی نقل ہے۔ دستور کے آرٹیکل 31 اور دیگر شقوں کو نصاب تعلیم کی تدوین میں راہنما نہیں بنایا گیا۔ ماڈل درسی کتب میں اسلامی اقدار کو درسی لوازمے کے تانے بانے میں شامل کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ انگریزی، معاشرتی علوم، سائنس اور ریاضی کی درسی کتب قطعی طور پر اسلامی نقطہ نگاہ (Islamic orientation) سے خالی ہیں۔ اسلامیات کا نصاب ٹیکنکل بنیادوں پر نادرست ہے کیونکہ پہلی سے دسویں تک نصاب کا ایک تسلسل ہوتا ہے جب کہ موجودہ پہلی سے پانچویں تک کا نصاب علیحدہ حصہ (Isolation part) تصور کرتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے لہذا نامناسب ہے۔ وزارت وفاقی تعلیم کو ہدایت کی جائے کہ نصاب کو از سر نو بچوں کی ضروریات اور قومی مقاصد تعلیم کی روشنی میں ترتیب دیا جائے اور ماہرین کی وسیع تر کمیٹیوں سے اسے منظور کرایا جائے۔

۲۔ نصاب محض درسی کتب کا نام نہیں ہے۔ اس میں تربیتِ اساتذہ، نظامِ امتحان، نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں اور ادارے کا ماحول سب شامل ہیں۔ وزارت وفاقی تعلیم کو ہدایت کی

جائے کہ مذکورہ تمام عناصر پر مبنی ایک جامع پیکیج تیار کر کے نصاب تعلیم کو جامع شکل میں نافذ کیا جائے اور نفاذ سے پہلے ماہرین کی رائے کی روشنی میں یقینی بنایا جائے کہ یہ نظریۂ پاکستان کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

۴۔ حکومت کا دعوٰی ہے کہ سنگل نیشنل کریکولم کی شکل میں وہ پورے ملک میں یکساں نظام تعلیم نافذ کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف درسی کتب میں کمی بیشی کی اجازت بھی دی گئی۔اے لیول، اولیول اور دیگر بیرونی امتحانات کی اجازت بھی موجود ہے۔ظاہر ہے امتحانات کے ساتھ بیرونی نصابات اور درسی کتب کی بھی اجازت ہے تو یہ ثنویت (Dichotomy) ختم کی جائے اور بیرونی امتحانات، بیرونی نصابات اور بیرونی درسی کتب پر فوری پابندی عائد کی جائے۔ چونکہ دینی مدارس بھی اب اس نظام کے تحت آجائیں گے لہذا دینی مدارس کے پورے سسٹم کو سٹڈی کر کے انہیں قومی دھارے میں لایا جائے۔اس سلسلہ میں قومی کانفرنس کر کے علماء کرام سے وسیع مشاورت کا اہتمام کیا جائے۔

۵۔ 18ویں دستوری ترمیم کے بعد اب نظام تعلیم، نصابِ تعلیم، درسی کتب اور معیارِ تعلیم کا تعین صوبائی مسئلہ ہے۔ وفاقی سطح پر اگر قومی نصابِ تعلیم تیار کرنا اور نافذ کرنا مقصود ہے تو نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور معیارِ تعلیم کے تعین کا پورا عمل قومی اسمبلی سے منظور کرانے کے بعد صوبائی اسمبلیوں سے بھی ان کی رضامندی (Concurrence) لی جائے تا کہ تعلیم کے اس پورے عمل کو جائز قانونی پشت پناہی حاصل ہو۔ محض بین الصوبائی وزارتی کانفرنس سے منظوری کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اس سے قومی اتفاق رائے حاصل نہیں ہوگا۔ سپریم کورٹ اس سلسلہ میں وزارت وفاقی تعلیم کو مناسب عدالتی ہدایت جاری کرے۔

۶۔ چونکہ دعوٰی کیا جا رہا ہے کہ وزارت وفاقی تعلیم سنگل نیشنل کریکولم نافذ کر کے یکساں نظام تعلیم کا ہدف حاصل کرے گی اس لیے ضروری ہے کہ یہ واحد قومی نصاب تجرباتی بنیادوں پر نافذ کیا جائے اور نتائج و حاصلات کی روشنی میں اس نصاب پر نظر ثانی کر کے حتمی شکل دی جائے تا کہ خامیوں کی وجہ سے پوری قوم کے بچوں کا تعلیمی نقصان نہ ہو۔

۷۔ نصاب جب بدلتا ہے تو اسے ایک تدریج کے ساتھ نافذ کیا جاتا ہے یک وقت سب جماعتوں کا نفاذ ٹیکنیکلی غلط ہے کیونکہ جس بچے نے مثلاً دوسری کا نیا نصاب نہیں پڑھا وہ تیسری

جماعت کا نیا نصاب کیسے پڑھ سکتا ہے۔اس لیے پرائمری سطح پر بھی نیا نصاب نافذ کرنے کے لیے عام طور پر تین سال درکار ہوتے ہیں۔اس امر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نئے نصاب کی ترتیب اور تدریج ماہرینِ تعلیم سے مشاورت کے بعد طے کر کے نافذ کیا جائے۔اس سلسلہ میں سپریم کورٹ وزارت وفاقی تعلیم اور صوبائی محکمہ ہائے تعلیم کو عدالتی ہدایت جاری کرے۔

۸۔ سیکولر لبرل لابی اور اقلیتوں کے بعض خود ساختہ لیڈران جن کے روابط وزارت وفاقی تعلیم کے بعض مؤثر افراد سے ہیں ایک نیٹ ورک بنا کر پاکستان کے نظام تعلیم کو جو پہلے بھی کافی حد تک سیکولر ہے، مکمل طور پر سیکولرائیز کرنا چاہتے ہیں۔اس سلسلہ میں ''امریکن کمیشن برائے بین الاقوامی آزادی''، برطانیہ اور جرمنی سمیت کئی اور ملکوں کی بین الاقوامی این جی اوز کی پشت پناہی، معاونت اور ان کی طرف سے پاکستان کے تعلیمی معاملات میں مداخلت کا ایک دراز سلسلہ شامل ہے۔اس لابی کے لوگ نیشنل کریکولم کونسل میں حاوی ہیں ماڈل ٹیکسٹ بکس کے مصنفین میں ان کی غالب اکثریت ہے۔مزید کنٹرول کے لیے درسی کتب کی ریویو کمیٹیوں میں اقلیتوں کا ایک ایک نمائندہ بٹھایا گیا ہے۔ یک رکنی اقلیتی کمیشن کے معاونین میں اس لابی کے لوگ شامل ہیں۔اس سیکولر لابی کے ہاتھوں نصاب تیار ہونے کے بعد، جو مکمل طور پر سیکولر بنیادوں پر بنایا گیا ہے، اسلامیات کے نصاب کے خلاف ایک زہریلی مہم چلائی گئی اور اے ایچ نیر عائشہ رزاق، ہود بھائی اور اسی طرح کے لوگوں کے انگریزی زبان میں شر انگیز مضامین انگریزی پریس میں چھپوائے گئے۔حتیٰ کہ یک رکنی کمیشن کی متعصبانہ رپورٹ جو ابھی سپریم کورٹ میں پیش بھی نہیں ہوئی تھی اس رپورٹ کو بنیاد بنا کر چار ماہ پہلے پنجاب کے اقلیتی امور کے محکمہ نے پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کو ہدایات جاری کر دیں کہ اسلامی مواد اردو، انگریزی اور معاشرتی علوم کی درسی کتب سے خارج کیا جائے۔ اس عجلت کی وجہ یہ نظر آئی کہ اقلیتی امور کے محکمہ کا پنجاب میں انچارج وزیر عیسائی تھا اور پیٹر جیکب اینڈ کمپنی نے انہیں مذکورہ رپورٹ سپریم کورٹ میں پیش کرنے سے پہلے پہنچا دی۔اس سے اس نیٹ ورک کی مضبوطی اور ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔

سپریم کورٹ کے فاضل ججوں سے استدعا ہے کہ وہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو اس سلسلہ میں ہدایات جاری کریں کہ اس طرح کے شر انگیز نیٹ ورک پر نظر رکھی جائے اور اسے دستور کی خلاف ورزی نیز نظریۂ پاکستان کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنے سے باز رکھا جائے نیز اس طرح

کے شریر عناصر کو فیصلہ ساز اداروں اور کمیٹیوں میں جگہ نہ دی جائے۔

۹۔ پشاور ہائی کورٹ نے جون 2018ء میں تعلیم میں بچوں کی تربیت اور تزکیہ کے کیس نمبر WP No.239-2018-P میں درج ذیل فیصلہ صادر فرمایا۔

1) Either of the respondents could not oppose the prayers so made by the petitioner in its writ petition, rather accepts the same in view of the need of the day, therefore, while allowing this writ petition as prayed for, the respondents are directed to implement the education policy in respect of character building (Tarbiyya & Tazkiyya) and to make it binding upon all the schools in private / public sector to follow it in letter and spirit and there should be strict examinations and tests in respect of Tarbiyya & Tazkiyya. Respondent No.5 is directed to make binding upon electronic media, programs to be aired in respect of guidance of masses in respect of Tarbiyya & Tazkiyya.

2) Copy of the judgment be sent to PEMRA, EPA, Ministry of Religious Affairs, Private School Regulatory Authority for monitoring and handling Education regarding Tarbiyya & Tazkiyya.

اس فیصلے کی روشنی میں وزارت وفاقی تعلیم اسلام نے مراسلہ نمبر

No.(F.6)3/239/2018-Legal Dated 05-07-2018

کے تحت محکمہ ہائے تعلیم کو فیصلے کی نقل کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ عدالت کے فیصلے کو نافذ کیا جائے اور اس کی رپورٹ ارسال کی جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اب تک اس فیصلے کے نفاذ کی کوئی خبر نہیں اور نہ ہی وفاقی حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی فالواپ کیا ہے۔ اس عدالتی فیصلے پر عمل درآمد نصاب، درسی کتب اور تعلیمی اداروں کی نصابی، ہم نصابی، غیر نصابی، رسمی اور غیر رسمی سرگرمیوں کے ذریعے سے ہی ہو سکتا ہے جن کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ سپریم کورٹ سے استدعا ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو پشاور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو اس کی روح کے مطابق نافذ کرنے کا حکم جاری کیا جائے۔

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی

# تعلیم میں مسابقت کا شیطانی کھیل

جدید نظام تعلیم مسابقت (Competition) پر کھڑا ہے۔ تاریخ انسانی میں کسی معاشرے میں مسابقتی امتحانات کا تعلیمی نظام موجود نہ تھا۔ تعلیم ہر علاقے کے وسائل، ذرائع اور ضروریات کے مطابق مقامی طور پر دی جاتی تھی۔ مغرب نے ''ایک تعلیم سب کے لیے'' کا جو جبر نافذ کیا ہے اس کے نتیجے میں اسکول، کالج، یونیورسٹی میں خودکشیوں کی شرح بہت بڑھ گئی ہے۔ دنیا میں سب سے بہترین تعلیمی نظام سنگاپور کا سمجھا جاتا ہے۔ IELTS، GRE، SAT،GMAT ، TOEFL میں بھی سنگاپور کے طلباء سب سے زیادہ کامیابی حاصل کرتے ہیں لیکن سنگاپور کے طلباء دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کرتے ہیں کیونکہ مقابلہ، مسابقت بہت سخت ہے اور ہر طالب علم عالمی معیارات تعلیم و امتحانات پر پورا نہیں اُتر سکتا کیونکہ اللہ نے ہر ایک کی ساخت ذہنی اور صلاحیت ایک جیسی نہیں رکھی لہٰذا ناکامی، بدنامی، ماں باپ کی توقعات پر پورا نہ اُترنے کے خوف سے بچے خودکشی کر لیتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی کسی تہذیب میں بچوں نے خودکشی نہیں کی۔ سب سے زیادہ خودکشی ترقی یافتہ قوموں کے بچے کرتے ہیں کیونکہ وہ ترقی میں پیچھے رہ گئے۔ جب ترقی عقیدہ ہو تو عقیدہ میں ناکامی کا انجام خودکشی ہے۔ امریکہ میں کالج جانے والے ۳۵ فیصد طلباء خودکشی کا سوچتے ہیں امریکہ میں لیڈی ڈاکٹر، فلسفی، آرٹسٹ، اداکار، Celebrity، کھلاڑی سب سے زیادہ خودکشی کرتے ہیں حالانکہ ان کی آمدنی سب سے زیادہ ہوتی ہے تفصیلات کے لیے صرف ایک کتاب پڑھ لیجیے جو دنیا کی اکثر جامعات میں پڑھائی جاتی ہے:

Abnormal Phychology by Ronald J. Comer

اس کتاب کا ایک باب Sucide دیکھ لیجیے۔

بھارتی طلباء میں خودکشی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے کیونکہ وہ بھی ترقی یافتہ ملک ہے۔ ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۶ء تک بھارت میں 2,60,500 طلباء نے خودکشی کی۔ صرف ۲۰۱۶ء میں 9,474 طلباء نے خودکشی کی یعنی تقریباً ہر گھنٹے میں ایک خودکشی۔ [جنگ کراچی، ۲۰/اگست ۲۰۱۹ء]

[پاکستان میں بھی تعلیم میں مسابقت نے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے۔ ''نمبر گیم'' کی

ایک لامتناہی دوڑ ہے جس میں بچوں کو جھونک دیا گیا ہے جس نے غیر صحت مند تعلیمی رجحانات کو فروغ دیا ہے جن میں رٹا بازی (روٹ لرننگ)، زیادہ نمبروں کے لیے غیر اخلاقی وغیر قانونی ذرائع کا استعمال، طلبہ وطالبات پر سخت محنت کی وجہ سے ذہنی دباؤ، والدین کی پریشانی (کیونکہ معروف تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے زیادہ نمبر ہی معیار ہیں) اور اساتذہ و تعلیمی انتظامیہ پر ذہنی دباؤ میں اضافہ شامل ہیں۔ اس طرز عمل میں نہ معیار مطلوب ہوتا ہے، نہ تخلیقی صلاحیتوں کا فروغ، نہ بچے کے ذہنی قوتوں کا ارتقا بلکہ مسابقت صرف نمبر گیم کے لیے ہوتی ہے (ادارہ)]۔

---

## بقیہ: 'مجمع العلوم الاسلامیہ' کی حمایت کا اعلان

ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کی قیادت نے اس مقصد کے لیے مطلوبہ جدو جہد نہیں کی۔ دینی مدارس ایک بڑی قوت ہیں۔ آئین وقانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے حکومت پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے اور اپنے مطالبات منوائے جاسکتے ہیں لیکن اس کے لیے ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو تبدیلی لانے، اپنی اصلاح کرنے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے پر جوش اور متحرک ہو۔ سٹیٹس کو (Status Quo) کی قائل نہ ہو (یعنی جو جیسا چل رہا ہے، خیر ہے، قابل گزارہ ہے)، ذاتی مفادات کی اسیر نہ ہو اور حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مزاحمت کر سکے۔ دینی مدارس کو اگر ایسی جری اور بے باک قیادت میسر آجائے تو ان کے بہت سے تعلیمی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ھذا من عندنا والعلم عند اللہ۔

---

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

ہوا حریفِ مہ و آفتاب تُو جس سے
رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ دُرخشانی

اقبال

دینی مدارس مدیر

دینی مدارس کا نظام تعلیم

# حقیقی تعلیمی مسائل سے حکومت اور علماء کی غفلت

* حکومت نے بڑی تعداد میں وفاق کیوں بنوائے ہیں؟ * علماء کرام کیا چاہتے ہیں؟
* ہمارا مؤقف یہ ہے کہ حقیقی تعلیمی مسائل اور ان کے صحیح حل سے نہ حکومت کو دلچسپی ہے نہ علماء کرام کو۔

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان نے دینی مدارس کے مزید ''وفاقوں'' (تعلیمی بورڈز) کی منظوری دے دی ہے اور اب ان کی کل تعداد پندرہ (۱۵) ہوگئی ہے۔

| نمبر شمار | نام وفاق | تاریخ رجسٹریشن |
|---|---|---|
| ۱ | وفاق المدارس العربیہ، ملتان | ۱۷-۱۱-۱۹۸۲ |
| ۲ | تنظیم المدارس اہل سنت، لاہور | ۱۷-۱۱-۱۹۸۲ |
| ۳ | وفاق المدارس السّلفیہ، فیصل آباد | ۱۷-۱۱-۱۹۸۲ |
| ۴ | وفاق المدارس الشیعہ، لاہور | ۱۷-۱۱-۱۹۸۲ |
| ۵ | رابطۃ المدارس الاسلامیہ، لاہور | ۱۲-۸-۱۹۸۷ |
| ۶ | اتحاد المدارس العربیہ پاکستان، مردان | ۴-۲-۲۰۲۱ |
| ۷ | اتحاد المدارس الاسلامیہ پاکستان، لاہور | ۴-۲-۲۰۲۱ |
| ۸ | نظام المدارس پاکستان، لاہور | ۴-۲-۲۰۲۱ |
| ۹ | مجمع المدارس تعلیم الکتاب والحکمۃ، لاہور | ۴-۲-۲۰۲۱ |
| ۱۰ | وفاق المدارس الاسلامیہ الرضویہ پاکستان | ۴-۲-۲۰۲۱ |
| ۱۱ | وفاق المدارس والجامعات الدینیہ الباکستان | ۱۵-۴-۲۰۲۱ |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۲ | مجمع العلوم الاسلامیہ، کراچی | ۱۵-۴-۲۰۲۱ |
| ۱۳ | وحدۃ المدارس الاسلامیہ پاکستان | ۱۵-۴-۲۰۲۱ |
| ۱۴ | بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن | ۲۷-۴-۲۰۲۱ |
| ۱۵ | کنز المدارس | ۲۷-۴-۲۰۲۱ |

اسی طرح حکومت نے جن بڑے دینی مدارس کو "انسٹی ٹیوٹ" کا درجہ دیا ہے اور وہ حکومت کی منظور شدہ دینی تعلیم کی ڈگری خود جاری کر سکتے ہیں، اب ان کی تعداد نو (۹) ہوگئی ہے۔

| نمبر شمار | نام انسٹی ٹیوٹ | تاریخ رجسٹریشن |
|---|---|---|
| ۱ | جامعہ تعلیمات اسلامیہ، فیصل آباد | ۷-۶-۱۹۸۴ |
| ۲ | جامعہ اشرفیہ، لاہور | ۳-۶-۱۹۸۵ |
| ۳ | دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ | ۸-۱-۱۹۸۷ |
| ۴ | دار العلوم کورنگی، کراچی | ۲۷-۸-۱۹۸۷ |
| ۵ | جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن | ۱-۲-۲۰۲۱ |
| ۶ | جامعۃ الرشید، کراچی | ۲۷-۴-۱۹۹۲ |
| ۷ | دار العلوم جامعہ نعیمیہ، لاہور | ۲۷-۴-۲۰۲۱ |
| ۸ | جامعہ المدینہ، کراچی | ۲۷-۴-۲۰۲۱ |
| ۹ | جامعہ الدراسات الاسلامیہ، کراچی | ۲۷-۴-۲۰۲۱ |

## حکومتی کردار

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ:

۱۔ جن وفاقوں کو امتحانی بورڈ اور جن مدارس کو دینی تعلیم کی ڈگری جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے وہ سب مخصوص مسالک پر مبنی ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حکومت ملک میں مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو فروغ دینے کی اپنی پرانی حکمت عملی جاری رکھے گی تا کہ ملک میں دینی

قوتیں کبھی متحد نہ ہوسکیں، آپس میں لڑتی رہیں اور اسٹیبلشمنٹ کے لیے کبھی خطرہ نہ بن سکیں۔

۲۔ حکومت نے نئے وفاقوں کے ساتھ تعلیم کے کسی اصلاحی ایجنڈے کی کوئی شرط نہیں رکھی اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تسلسل کی اجازت دے دی ہے۔

۳۔ حکومت کے پیشِ نظر غالباً یہی تھا کہ پرانے وفاقوں کی اجارہ داری توڑی جائے، انہیں کمزور کیا جائے اور ان سے اپنی مرضی کی شرائط منوائی جائیں۔ نئے وفاقوں کی منظوری ظاہر ہے وہ اسی شرط پر دے رہی ہے کہ نئے وفاق رجسٹریشن وغیرہ کے معاملات میں حکومتی موقف کے آگے فرمانبردارانہ رویہ اختیار کریں گے۔

۴۔ دینی تعلیم کے حوالے سے اگر پاکستان کی ۷۴ سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کو دینی تعلیم یا اس کی بہتری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اس موضوع پر صرف اس وقت متحرک ہوتی ہے جب بوجوہ مغرب اس پر دباؤ ڈالے یا اسٹیبلشمنٹ کا اپنا کوئی مفاد اس سے جڑا ہو جیسے ''پیغام پاکستان'' والا بیانیہ۔

۵۔ پاکستانی حکومتوں نے جدید تعلیم اور اسے اسلام کے مطابق ڈھالنے میں بھی کبھی دلچسپی نہیں لی۔ الٹا مغرب کے دباؤ پر نظامِ تعلیم کو سیکولر و لبرل بنانے پر زور رہا ہے اور آج بھی ہے۔

## دینی مدارس کے علماء کرام کا موقف

۱۔ دینی مدارس کے علماء کرام چاہتے ہیں کہ انہیں مسلک کی بنیاد پر دینی مدارس جیسے وہ چاہیں چلانے کی آزادی ہونی چاہیے اور حکومت ان کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔

۲۔ وہ خود کوئی اصلاحی ایجنڈا نہیں رکھتے اور نہ خود کو بدلنے پر تیار ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح خطوط پر کام کر رہے ہیں جو جاری رہنا چاہیے۔

اگرچہ نئے بننے والے بعض وفاق اصلاح اور جمع بین القدیم والجدید کے حامی ہیں اور ان میں سے جامعۃ الرشید کراچی تو پہلے سے یہ کام کر رہی تھی، ہم اس کی حمایت کرتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کو اس کام کے تقاضوں اور پیچیدگیوں کا اتنا گہرا ادراک نہیں ہے جتنا ہونا چاہیے اور نہ ان اقدامات کی طرف ان کی توجہ ہے جو اس ضمن میں اٹھائے جانے ناگزیر ہیں۔

## تعلیمی حوالے سے کرنے کے کام

حکومت دینی تعلیم کو اہمیت دینا، اس کی ذمہ داری لینا، اس کے لیے اچھا بجٹ مہیا کرنا، دینی

تعلیم کے غیر مسلکی فعال ادارے قائم کرنا۔ نصابات ، امتحانات اور دیگر امور میں علماء کرام کی مشاورت سے اصلاح کرنا۔ دینی مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کرنا، ان کو مدارس چلانے میں سہولتیں دینا۔عصری تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنا اور اسے مغرب کی ملحدانہ فکر،تہذیب اور تعلیم کے پنجے سے نکالنا۔ نظام تربیت وتزکیہ کو اہمیت دینا۔تعلیمی ثنویت کا خاتمہ۔مسلک پرستی کی حوصلہ شکنی۔

علماء کرام

مقاصد تعلیم پر نظر ثانی کرنا (صرف مسجد ومدرسہ کے لیے علماء تیار نہیں کرنا بلکہ مسلم فرد، معاشرے اور ریاست کے لیے عالم،معلم اور کارکن تیار کرنا)۔دینی مدارس کے نصابات ونظام پر نظر ثانی کرنا تاکہ وہ اپنا کردار زیادہ مفید اور مؤثر انداز میں ادا کرسکیں اور ایسے علماء تیار کرسکیں جو عصری تقاضوں اور چیلنجز کو سمجھتے ہوں اور ان میں معاشرے کی رہنمائی کر سکتے ہوں۔عصری علوم ونصابات کی اسلامی تشکیل نو کرنا تاکہ کروڑوں مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت صحیح رُخ میں ہو۔تعلیمی ثنویت کا خاتمہ۔دینی وعصری علوم کے امتزاج کے لیے موزوں منہج ترتیب دینا۔ پہلے مرحلے میں علوم اسلامیہ، دوسرے مرحلے میں اسلامی تناظر میں عمرانی علوم کی تدریس اور سب سے آخر میں سائنسی علوم وفنون کی تدریس۔

------------------

## اعتذار

کچھ ہفتے پیشتر جب مولانا فضل الرحمن صاحب کا وفاق المدارس العربیہ کا صدر بننے کا معاملہ زیر بحث تھا، البرہان میں عبداللہ میر صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا جس پر مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب اور مولانا یٰسین ظفر صاحب کا یہ ردّعمل سامنے آیا کہ اس سے ان کی دل آزاری ہوئی ہے۔

البرہان ایک علمی وفکری پرچہ ہے اور اس میں اصلاحی اور اختلافی مباحث چلتے رہتے ہیں تاہم کسی دینی قائد یا عالم دین کے خلاف ذاتی ریمارکس دینا اس کی پالیسی کا حصہ نہیں ہے۔ہم اس سلسلے میں آئندہ مزید احتیاط کی کوشش کریں گے، ان شاءاللہ

دینی مدارس مدیر

## جامعۃ الرشید اور جامعہ بنوریہ کی طرف سے قائم کردہ نئے وفاق

# 'مجمع العلوم الاسلامیہ' کی حمایت کا اعلان

* ہم وفاق المدارس العربیہ کے مقابلے میں مجمع العلوم الاسلامیہ کی حمایت کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ اصلاح کا علمبردار ہے اگرچہ اس کا موجودہ اصلاحی ایجنڈا مخدوش اور ناقص ہے۔
* مجمع العلوم الاسلامیہ اور دوسرے وفاقوں کا اصلاحی ایجنڈا کیا ہونا چاہیے؟
* عصری اور دینی علوم کے امتزاج اور تعلیمی ثنویت کے خاتمے کا صحیح طریق کار کیا ہے؟

دینی مدارس کے وفاقوں کو حکومت پاکستان کی طرف سے دینی تعلیم کے لیے منظور شدہ ''امتحانی بورڈز'' کا درجہ دینے کا جو مظہر سامنے آیا، اس کے کچھ فائدے بھی ہوئے لیکن اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ دینی مدارس کے نصاب ونظام کی اصلاح مشکل ہوگئی مثلاً وفاق المدارس العربیہ، جو سب سے بڑا وفاق ہے، کو لیجیے کہ اس میں تقریباً ۱۸ ہزار کے قریب مدارس ہیں۔ اس کی مجلس شوریٰ کئی سو افراد پر مشتمل ہے اور اس کی نصاب کمیٹی غالباً ۶۰ افراد پر مشتمل ہے جس میں کئی طرح کی لابیاں ہیں، علاقائی اور لسانی مسائل ہیں۔ قبائلی جمود پسند اور شہری (قدرے) لبرل رجحانات کے حامل لوگ موجود ہیں اور انہیں کسی نصابی تبدیلی کی طرف لانا مشکل ہے۔ اور جب وفاق نے ایک نصابی اور امتحانی ڈھانچہ بنالیا اور وہ اسے بدلنے پر تیار نہیں تو اب عام دینی مدارس کیا کریں؟ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ وفاق کے نصاب ونظام کے پابند ہیں۔ نصاب میں کوئی حک واضافہ کیسے کریں؟ اس طرح دینی مدارس میں نصاب میں کسی اصلاح کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔

اس کے برعکس جامعۃ الرشید نے اصلاح کا تصور قبول کیا اور تعلیمی ثنویت کے خاتمے اور دینی علوم وعصری دنیوی علوم کے امتزاج پر مبنی نصاب کے تجربات شروع کیے اور اب انہوں نے جامعہ بنوریہ کے ساتھ مل کر حکومت سے نیا وفاق یا امتحانی بورڈ 'مجمع العلوم الاسلامیہ' کے نام سے منظور کرالیا ہے۔ ہم اس نئے وفاق کو خوش آمدید کہتے ہیں (اور نئے وفاقوں میں سے بھی ان کو جو اصلاح کے مدعی ہیں خصوصاً منہاج القرآن کا ''نظام المدارس'' اور جامعہ العروۃ الوثقیٰ (اہل تشیع)

کا ''نجم المدارس تعلیم الکتاب والحکمہ''، جن سے ہمارا ابتدائی رابطہ ہوا ہے۔

تحریک اصلاح تعلیم پچھلی ربع صدی سے دینی مدارس کی اصلاح پر کام کر رہی ہے۔ ہم نے اس موضوع پر برسوں سوچا اور لکھا ہے اور ہماری تین کتابیں اس موضوع پر طبع ہو چکی ہیں:

- ہمارا دینی نظام تعلیم
- نصاب مدنی
- اصلاح دینی مدارس

دینی مدارس اور وفاقوں میں سے جو لوگ اس موضوع پر ہماری تجاویز سے آگاہ ہونا چاہیں وہ ان کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔ اگر کوئی چیز سمجھ میں آجائے اور اچھی لگے تو اس حکیمانہ قبول کے مطابق اسے قبول فرمالیں کہ ''یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔''

## اصلاح کا ایجنڈا

مجمع العلوم الاسلامیہ اور دیگر اصلاح پسند وفاقوں اور دینی مدارس (خصوصاً وہ نو (۹) بڑی جامعات جنہیں انسٹی ٹیوٹ قرار دے کر اپنی ڈگری دینے کا اختیار دیا گیا ہے) کا اصلاحی ایجنڈا کیا ہونا چاہیے؟ ہماری رائے میں اس کی ترتیب یہ ہونی چاہیے:

۱۔ دینی مدارس کے 'مقاصد تعلیم' پر نظر ثانی۔ یعنی مساجد و مدارس کے لیے علماء تیار کرنے کا محدود مقصد چھوڑ کر ایسے عالم، معلم اور کارکن تیار کرنا ہو جو مسلم فرد، معاشرے اور ریاست کی اصلاح کریں اور انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے قابل بنائیں۔

۲۔ درس نظامی کے نصاب پر نظر ثانی۔ اس میں حک و اضافے

۳۔ عصری علوم اور ان کے نصابات کی اسلامی تشکیل نو اور نئی نصابی کتب کی تیاری

۴۔ علوم کی تدریس میں ترجیحات کا تعین: سب سے پہلے علوم اسلامیہ کا تخصص۔ پھر علوم عمرانیہ کی اسلامی تناظر میں تدریس۔ پھر سب سے آخر میں سائنسی علوم و ٹیکنالوجی

۵۔ عصری علوم اور دینی علوم کے امتزاج یا تعلیمی ثنویت کے خاتمے کے لیے موزوں منہج

اختیار کرنا۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

## دینی و عصری علوم کے امتزاج یا تعلیمی ثنویت کے خاتمے کا صحیح منہج

اس موضوع پر ہماری کئی مختصر اور طویل تحریریں موجود ہیں۔ یہاں ہم چند اہم نکات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائیں گے۔

تعلیمی ثنویت مسئلہ کے حل کی سیدھی اور سادہ صورت یہ ہے کہ:

i۔ ملک میں نظام تعلیم ایک ہو جو اسلامی اصول و روایات پر مبنی ہو، عصری ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہو اور مستقبل میں طلبہ کو اچھا باعمل مسلمان بنانے والا ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم میں مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب اور اس کے نظام تعلیم کی پیروی ترک کر دی جائے۔

ii۔ زندگی کے دوسرے تخصصات کی طرح 'دینی علوم میں تخصص' کا بھی بہت عمدہ انتظام ہو جو رسوخ فی العلوم رکھنے والے ایسے متقی علماء پیدا کرے جو عصری ضرورتوں اور تقاضوں سے بخوبی واقف ہوں اور عصری مسائل کے حل میں معاشرے و ریاست کی رہنمائی کر سکیں۔

## عملی صورت حال

اس وقت عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ:

۱۔ حکومت عصری تعلیم یا تعلیم کے مرکزی دھارے (Mainstream Education) کو مغرب کے دباؤ پر یا اس سے متاثر ہو کر سیکولر و لبرل بنیادوں پر چلا رہی ہے اور چلانا چاہتی ہے اور اسے اسلامی اصولوں پر استوار کرنا نہیں چاہتی۔

۲۔ وہ چاہتی ہے کہ دینی مدارس بھی اس مرکزی تعلیمی دھارے کا حصہ بن جائیں۔ دینی مدارس اس کی مزاحمت کرتے ہیں کیونکہ وہ بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح وہ مرکزی تعلیمی دھارے میں جذب ہو جائیں گے اور اپنا وجود کھو بیٹھیں گے۔

۳۔ لیکن اس کے باوجود دینی مدارس نہ تو اپنی اصلاح کا کوئی ایجنڈا رکھتے ہیں اور نہ جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہیں۔

۴۔ انہیں داخلی طور پر اصلاح کی ضرورت اس لیے ہے کہ تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر جب

موجودہ طرز کے دینی مدارس وجود میں آئے تو اس وقت انگریزی استعمار کا دور تھا۔ مسلم نظام تعلیم منہدم کر دیا گیا تھا، ریاست کے لیے افراد تیار کرنا ان کے پیش نظر نہ تھا۔ یوں وہ مساجد کی آبادی اور اسلامی معاشرتی رسوم کے احیاء کے لیے انتہائی محدود نصاب اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد حالات بدل چکے۔ اب مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے افراد کا تیار نہ کرنا اپنے ساتھ بھی زیادتی ہے اور دین وملک کے ساتھ بھی لہٰذا دینی مدارس کے مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنا ناگزیر ہے۔ ہم نرم سے نرم الفاظ استعمال کریں تو بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ایسا نہ کرنا خلاف عقل بھی ہے اور خلاف مقاصد دینیہ بھی کیونکہ اس سے غلط تصور دین سامنے آتا ہے، سیکولرزم ابھرتا ہے اور عملاً علماء کرام فرد، معاشرے اور ریاست کی عدم اسلامائزیشن کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔

- یہاں اس تفصیل میں جانے کا محل نہیں کہ دینی مدارس کے نظام ونصاب تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ یہ ایک مستقل اور تفصیل طلب موضوع ہے جس پر پہلے بھی ہم نے لکھا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ یہاں ہم چند اہم باتوں کی طرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں جیسے علوم قرآن وسنت پر عبور، دیگر دینیاتی مواد میں حک واضافے، اجتہادی بصیرت پیدا کرنا، عصر حاضر کے چیلنجز کی تفہیم ورڈ اور اسلامی تفوق کا اثبات وغیرہ۔

- عصری علوم کو موجودہ صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے خون میں مغرب کے الحادوزندقہ کا زہر شامل ہے لہٰذا علماء کرام اگر جدید علوم سیکھنا سکھانا چاہتے ہیں تو پہلے ان کی اسلامی تشکیل نو تو کریں۔ یہ کوئی عذر نہیں کہ حکومت نہیں کرتی۔ حکومت نہیں کرتی تو آپ خود کریں۔ یہ آپ کی شرعی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔

- یہ بالکل ناگزیر ہے کہ دینی مدارس اپنے مقاصد تعلیم پر نظر ثانی کریں اور صرف مسجد ومدرسہ کے لیے علماء تیار کرنے کی بجائے مسلم فرد کی دینی تعلیم وتربیت کو بھی اہمیت دیں اور مسلم معاشرے وریاست کے لیے بھی صالح کارکن تیار کریں۔

- اس کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ دینی مدارس اپنے موجودہ تعلیمی نصاب ونظام خصوصاً تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلیاں (Structural Changes) لائیں اور مرکزی تعلیمی دھارے

کے اہم مضامین جیسے سائنس وٹیکنالوجی ، میڈیکل، انجینئرنگ، کمپیوٹر سائنس، بزنس وغیرہ کو سردست التوا میں رکھ کر:

* مڈل تک کی تعلیم اپنے پاس رکھیں اور اس کی اسلامی تشکیل نو کریں۔

* تخصص کے اگلے ۸ سال میں وہ طلبہ کو علوم اسلامیہ اور اسلامی تناظر میں علوم عمرانیہ پڑھائیں۔

یاد رہے کہ عمرانی علوم اسلامی تناظر میں پڑھانا ''علوم دینیہ'' ہی کا حصہ ہے۔کیا اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا معاشی نظام، اسلام کا قانونی نظام.... پڑھانا اور ان میں اسلامی تعلیمات کا مغربی نظریات پر فائق ہونا ثابت کرنا دینی تعلیم نہیں؟ کیا آپ کے مدارس ماضی بعید سے قانون (فقہ)، فلسفہ، منطق، ادب وغیرہ نہیں پڑھاتے آرہے تو ہم کون سی نئی بات کررہے ہیں؟ صرف ڈگری کے نام کا فرق ہوگا جیسے علوم دینیہ محضہ میں تخصص کرنے والے کی ڈگری کو''ایم اے علوم اسلامیہ'' کہا جائے گا اور دینی علوم کے مطالعے کے ساتھ معاشیات میں ڈگری لینے والے کو''ایم اے اسلامی معاشیات'' کہا جائے گا۔ یہ ڈگری حاصل کرنے والے افراد، معاشرے اور ریاست کے مختلف اداروں میں جاکر کام کریں گے اور ان کی اصلاح کریں گے۔

دینی علوم کے تخصص میں اس وقت ایک ہی آٹھ سالہ پروگرام 'درس نظامی' کے نام سے چل رہا ہے جس میں تنوع کی ضرورت ہے۔

ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ دینی تعلیم سے متعلق لوگ اپنا 'ثانوی تعلیمی بورڈ' کیوں نہیں منظور کراتے تاکہ وہ ثانویہ عامہ اور ثانویہ خاصہ کے چار سال کے نصابات کو اپنے مضامین سے ہم آہنگ کرسکیں۔

* اور انہی مضامین میں وہ اپنے طلبہ کو ایم فل و پی ایچ ڈی کرائیں۔اس کے لیے وہ کم از کم اپنی ایک یونیورسٹی ہی بنالیں۔

۔ اگرچہ ابتدائی ومتوسط سطح کی تعلیم کے نصاب ونظام کی اسلامی تشکیل نو بھی کم اہم نہیں تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر علوم ونصابی کتب کی اسلامی تشکیل نو زیادہ اہم ہے کیونکہ اسی سطح پر تعلیم کی مغربائزیشن اور اس کا سیکولر ولبرل کردار زیادہ نقصان کا سبب بن رہا ہے۔

لیکن ہم نہایت افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ روایتی دینی جماعتیں اور دینی مدارس تو رہے ایک طرف کسی جدید دینی تحریک، اساتذہ وطلبہ کی کسی انجمن، پرائیویٹ جامعات اور اسی طرح پبلک سیکٹر کے کسی متعلقہ ادارے جیسے ہائر ایجوکیشن کمیشن اور سرکاری جامعات میں سے کسی کو یہ کام کرنے کی توفیق نہیں ہوئی اور نہ اس کام کی طرف کسی کی توجہ ہے۔

## تحریک اصلاح تعلیم کی پیشکش

### علوم ونصاب کی اسلامی تشکیل نو کے لیے خصوصی اکیڈمی کا قیام

تحریک اصلاح تعلیم نے ماضی میں بھی کئی دفعہ دینی قوتوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے خصوصاً سکول اور دینی مدارس کے نصابات کی سطح پر اس نے کافی محنت کی ہے (جو مطبوعہ موجود ہے) اور اس نے نصابی کتب کی تیاری واشاعت کے لیے سکولوں اور دینی مدارس کو پیشکش کی ہے کہ وہ انہیں نئی نصابی کتب مدون کر کے دینے کو تیار ہے لیکن جب اس کا کوئی طلب گار ہی نہیں، کوئی تعاون کرنے اور لینے کو تیار ہی نہیں تو ہم ہوا میں تیر کیسے چلائیں؟ ہم اب بھی دینی مدارس کے وفاقوں، پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر جامعات اور دوسرے متعلقہ حلقوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایک ''اکیڈمی برائے علوم ونصابی کتب کی اسلامی تشکیل نو'' (Academy for Islamic Reconstruction of Knowleged & Text Books [AIRKOTB]) قائم کر کے اسلامی، عمرانی اور سائنسی علوم اور ان کی نصابی کتب کی اسلامی تشکیل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ہمارا ساتھ دیں اور ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ ہم اگر محنت کر کے کچھ کام کریں اور اس کا استعمال کرنے والا کوئی نہ ہو تو ظاہر ہے اس طرح کا پراجیکٹ نہیں چل سکتا۔

ہماری رائے میں اس وقت تعلیمی ثنویت کے خاتمے کا صحیح طریق کار وہی ہے جس کی ہم نے سطور بالا میں نشاندہی کی ہے۔ اور اس کے بغیر ''قدیم وجدید کا حسین امتزاج'' اور ''دینی وعصری علوم کی یکجائی'' کے نعرے یا ان پر عمل سے اسلامی نقطۂ نظر کو نقصان دہ ہوگا اور مستقبل میں اس کے نتائج انتہائی ضرررساں ہوں گے اور بالآخر اسلامی اصول وروایات پر مغربی فکر وتہذیب کے غلبے پر منتج ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ روز بد دیکھنے سے بچائے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۹)

غلبۂ دین مدیر

# اقامتِ دین اور غلبۂ دین کی بحث

ہم نے ایک صاحب کے استفسار پر البرہان کے پچھلے شمارے میں قرآن حکیم میں اقامت دین کے تصور پر مختصر گفتگو کی تھی۔ اس جواب سے مستفسر کی تسلی نہیں ہوئی اور انہوں نے ہمارے جواب پر تنقید کی ہے۔ اسی طرح کراچی کے معروف اسلامی سکالر جناب سید خالد جامعی صاحب نے بھی ہماری توجہ دو سوالوں کی طرف دلائی ہے جو اقامت دین وغلبۂ دین کے حامیوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم پہلے مستفسر کا اپنے مؤقف پر تبصرہ پیش کریں گے۔ پھر جامعی صاحب والے سوال سامنے رکھیں گے اور پھر ان کا جواب دینے کی کوشش کریں گے، وبیدہ التوفیق.

مستفسر: دیکھیے جناب! مَیں نے آپ سے پوچھا تھا کہ قرآن حکیم میں اقامت دین سے متعلق جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں آپ کے نزدیک اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ جواب میں آپ نے 'اقامت دین' کی ایسی پھسپھسی تشریح کی ہے جو میری رائے میں ناقص اور غیر متوازن ہے کیونکہ آپ نے اسے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس سے جوڑ دیا ہے اور اسے اظہار دین وغلبۂ دین سے کاٹ دیا ہے حالانکہ قرآن حکیم کے ارشادات اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تین دفعہ فرمایا:

۱۔ ﴿هُوَالَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ﴾[التوبہ ۹: ۳۳، الفتح ۴۸: ۲۸، الصف ۶۱: ۹]

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تا کہ اُسے ہر دوسرے دین پر غالب کر دے، چاہے مشرک لوگوں کو یہ بات کتنی ناپسند ہو۔''

۲۔ ﴿وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ﴾ [الانفال ۸: ۳۹]

''اور ''مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔ پھر اگر یہ باز آ جائیں تو ان کے اعمال کو اللہ خوب دیکھ رہا ہے۔''

۳۔ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۳:۱۳۹]

''اور اگر تم واقعی مومن ہو تو تم ہی سر بلند رہو گے۔''

۴۔ ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الانبیاء ۲۱:۱۰۵]

''اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔''

لہٰذا غلبۂ دین ضروری اور اقامت دین فرض ہے بلکہ افضل الفرائض ہے اور ہر مسلمان اس کے لیے جدو جہد کرنے کا مکلف ہے اور یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصود اور نصب العین ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے بہت بڑے عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جب اسلامی مقاصد کے لیے جماعت بنائی تو اس کا نصب العین اقامت دین رکھا۔ دستور جماعت کی چوتھی شق ہے: ''جماعت اسلامی پاکستان کا نصب العین اور اسکی تمام سعی و جہد کا مقصد عملاً اقامت دین (حکومت الٰہیہ یا اسلامی نظام زندگی کا قیام) اور حقیقتاً رضا الٰہی اور فلاح اخروی کا حصول ہو گا۔''

سید مودودیؒ اس کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کا نظام زندگی فساق و فجار کے ہاتھوں سے نکل کر اللہ کے صالح بندوں کے ہاتھ میں آ جائے جو اس کی شریعت اللہ کی زمین میں نافذ کریں، قوانین اسلامی ہوں اور اللہ کا دین ماسوا اسلام ہر چیز پر غالب آ جائے۔

## سید خالد جامعی صاحب کا مشورہ

جامعی صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ ہمیں غلبۂ دین کے حامیوں کے مندرجہ ذیل دو سوالوں کے جواب بھی دینا چاہئیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ دین پر مکمل عمل کیا قیام امارت کے بغیر ممکن ہے؟ موکول علی

السلطان کی اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟ جہاد، زکوٰۃ، حدود، بیت المال وغیرہ کا قیام امارت کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ دوسرے معنوں میں احکامِ دین پر کامل عمل کے لیے امارت کا قیام واجب ہوگا یا نہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے قوت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ مثلاً باپ، بیٹے کو معروف اور منکر پر عمل کے لیے تادیبی اقدامات کرسکتا ہے تو کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے امارت کی قوت کیا ضروری ہے یا نہیں ہے؟

سطور بالا کی بحث سے مندرجہ ذیل سوالات منقح ہوکر ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ قرآن حکیم اور سنت رسول (ﷺ) کی رو سے اور جمہور اہل علم کے نزدیک اقامت دین اور غلبہَ دین کا مفہوم کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ قرآن حکیم میں انبیاء کرام کی بعثت کے کیا مقاصد بیان کیے گئے ہیں؟ کیا سارے پیغمبر اقامت دین واظہار دین کے داعی اور مکلف تھے؟

۳۔ قرآن وسنت کی رو سے اور جمہور اہل علم کے نزدیک اقامتِ دین واظہار دین کا منہج، طریق کار اور حکمت عملی کیا ہے؟

۴۔ اقامتِ دین واظہار دین کے حکم پر عمل ہم عصر مسلم معاشرے اور ریاست میں کیسے ہوگا؟

۵۔ جدید دینی تحریکوں خصوصاً مولانا ابوالاعلی مودودیؒ نے 'اقامت دین' کی جو فکر پیش کی ہے اور جماعت اسلامی کے ذریعے اسے جس طرح پاکستان میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بارے میں ہماری رائے کیا ہے؟ کیا وہ صحیح ہے یا غلط؟

ہم ان شاء اللہ البرہان میں ان سوالات کا واضح اور تفصیلی جواب دیں گے اور اگر ان پر مستفسر کی یا کسی اور کی تنقید سامنے آئی تو ان شاء اللہ اس کی بھی وضاحت کریں گے۔ یوں یہ علمی بحث آگے بڑھے گی اور توقع ہے کہ مفید اور مثمر ثابت ہوگی، ان شاء اللہ۔

یادرفتگان

محمد دین جوہر

# مولانا وحیدالدین خانؒ۔حاصلِ جدوجہد

معروف دینی عالم مولانا وحیدالدین خانؒ (۱۹۲۵۔۲۰۲۱ء) اللہ کے حضور پیش ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات عالیہ سے سرفراز کرے۔

مولانا مرحوم علماء کی اس بڑی تعداد کا اہم حصہ تھے جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنی مبسوط علمی اور تعبیراتی کاوشوں سے اس سوال کا جواب دیا کہ "اسلام کیا ہے؟" اور مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیونکر رہنما ہے۔ انہوں نے اپنی دو اہم کتابوں "علم جدید کا چیلنج" اور "اسلام۔ دور جدید کا خالق" میں آقائے سرسید کے طے کردہ ہمارے راس المسئلہ کو پھر سے زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں نیک طبیعت، مذہبی ذہن، متقی احوال اور عدمِ استعداد کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ آقائے سرسید کے بعد ان کی حیثیت حرفِ مکرر کی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ آقائے سرسید کے ام الجوابات کو مزید مؤید اور گہرا کر دیتی ہیں۔ مابعد سرسید عہد کا بنیادی سوال انہی کا طے کردہ ہے کہ اسلام بطور مذہب، اپنی فکر اور عمل میں، اب صرف جدیدیت کی شرائط پر زندہ رہ سکتا ہے۔ آقائے سرسید کے تہذیبی منصوبے کی مکمل کامیابی نے ایسی کوئی جگہ باقی ہی نہیں رہنے دی جہاں کھڑے ہو کر راس المسئلہ پر کوئی سوال اٹھایا جا سکے۔ مابعد سرسید جو سوالات بھی اٹھائے جاتے رہے ہیں وہ آقائے سرسید کی پیدا کردہ شعور و عمل کی پوری تہذیبی کائنات کے اندر کھڑے ہو کر ہی سوچے ہیں۔ اسلام پر علمی گفتگو کا مالابدمنہ یہ سوال ہے کہ جدیدیت سے منفک اور وراء لیکن اس کے بالمقابل اسلام کی کیا معنویت ہے اور وہ خود کو اور جدیدیت کو کیسے دیکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات کا تعین تو فکری کاوش کے بعد ہی ہو سکتا ہے لیکن اولاً یہ سوال ہی اٹھانے کے لیے ہمیں علمی مقدمات کی ضرورت ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اہل سرسید کے علاوہ ہر نوع کی مذہبی فکر بھی اب یہ سوال اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی۔

یادرفتگان مدیر

# مولاناوحیدالدین خانؒ پرشاہنواز فاروقی کی ناروا تنقید

## جماعت اسلامی کے اہل علم کواپنےفکرونظر میں وسعت پیدا کرنی چاہیے اورعلمی مخالفین کی تنقیدکوبرداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے

مولاناوحیدالدین خانؒ اس دنیا سے عالم آخرت کوسدھار گئےتو ان کے ہم خیالوں نے ان کی مدح کی۔ بھارت کے کئی سکالرز بشمول جماعت اسلامی کے ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر وارث مظہری، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی وغیرہ نے بھی ان کے بارے میں لکھا، ان کی آراء سے اختلاف بھی کیا لیکن کسی نے ان پر اس طرح کی سفاکانہ تنقید نہیں کی جس طرح کی تنقید محترم شاہنواز فاروقی صاحب نے اپنے کالم میں کی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ تحریر پڑھ کر صدمہ ہوا اور یقین نہیں آیا کہ یہ شاہنواز فاروقی صاحب کی تحریر ہے۔ ان کی تنقید غیرعلمی، غیرمناسب، مناظرانہ اور متعصبانہ ہے۔ مولانا مودودیؒ کی علمی وجاہت وعظمت بیان کرنے کا یہ کیا اسلوب ہے کہ ان کے علمی مخالف کی تحقیر کی جائے، اسے چھوٹا ثابت کیا جائے، اسے عالم دین ماننے سے انکار کردیا جائے، اس کی خوبیوں کا انکار کردیا جائے، اُسے جاہل، احمق اور کفار کا ایجنٹ قرار دیا جائے اور موت کے بعد بھی اس کی بھرپور مذمت کی جائے۔ بالکل یہی رویہ میرے ساتھ ایک پرانے جماعتی فاضل دوست کا ہے کہ جب کبھی میں البرہان میں مولانا مودودیؒ سے فکری اختلاف کرتا ہوں انہیں اس میں سے میرا 'خبثِ باطن' جھلکتا نظر آتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تم مولانا مودودیؒ کے مقابلے میں بڑے بننا چاہتے ہو حالانکہ انہیں ہر دفعہ اپنے اخلاص کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسا نہیں ہے۔

شاہنواز فاروقی صاحب اور ہمارے اس فاضل جماعتی دوست کے اس رویے کی توجیہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے شعور ولاشعور میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ان کا قائد سچا ہے باقی سب جھوٹے ہیں۔ ان کا قائد عظیم ہے باقی سب حقیر ہیں۔ ان کے قائد کا فرمایا ہوا ہر حرف، حرفِ آخر ہے اور ان کے قائد کے مخالف کا ہر حرف قابل ردّ ہے۔ کسی کا سید مودودیؒ سے اختلاف کرنا یا ان

پر تنقید کرنا انہیں ہضم ہی نہیں ہوتا، اسے وہ برداشت ہی نہیں کر پاتے۔ ظاہر ہے یہ رویہ ہرگز علمی رویہ نہیں ہے۔ علم کی دنیا استدلال کی دنیا ہے۔ نبوت ختم ہو چکی۔ اب کسی پر وحی نہیں اترتی کہ اس کے سامنے آنکھیں بند کر کے سر جھکا دیا جائے۔

اس سلسلے میں راقم کے ساتھ جو ہوا اور ہوتا رہتا ہے وہ ایک پوری داستان ہے جسے ہم فی الحال مؤخر کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات کہے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ جماعت اسلامی کی ناکامی کا ایک بنیادی سبب اس کی علمی اور سیاسی قیادت کا یہی رویہ ہے کہ وہ اپنے کام میں غلطی کا امکان تسلیم نہیں کرتی، اپنی ناکامیوں کا تجزیہ نہیں کرتی اور ان سے سبق نہیں سیکھتی۔ جماعت کی سیاسی قیادت کے 'اعذار' اور 'مجبوریاں' تو سمجھ میں آتی ہیں لیکن 'علمی قیادت' کا یہ غیر علمی رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔

---

شاعر بھی ہیں پیدا، عُلما بھی، حُکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

بہتر ہے کہ شیروں کو سِکھا دیں رمِ آہُو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

اقبال

عالم اسلام اوریا مقبول جان

# سانحہ بیت المقدس اور سیکولر مسلم حکمران

جب کبھی مسلمانوں کے کسی خطے پر کوئی سانحہ رونما ہوتا ہے، کوئی ظلم کی داستان رقم ہوتی ہے تو پاکستان کا سیکولر، لبرل دانشور، اور اس کی پیروی میں مخصوص اخباری لکھاری یا ٹیلی ویژن نیوز اینکر نتھنے پھلا کر دو گھڑے گھڑائے سوالات کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سوال صرف اسلام اور مسلمانوں سے اپنی نفرت اور بغض کے اظہار اور مسلمانوں کو بحیثیت امت بدنام کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کہاں ہے مسلم اُمّہ ؟ اور دوسرا سوال ہوتا ہے کہاں ہے ''او آئی سی'' (اسلامی کانفرنس)؟ برونائی سے لے کر مراکش تک پچاس سے زیادہ ممالک ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے لیکن ان تمام ممالک پر گزشتہ ایک سو سال سے سیکولر، لبرل حکمران مسلط ہیں۔ یہ حکمران، خواہ وہ بادشاہ ہوں یا جمہوری رہنما، فوجی ڈکٹیٹر ہوں یا فوجی آمر سب کے سب کلمہ طیبّہ پڑھتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے یورپی یونین کے انتیس ممالک کے عیسائی حکمران بپتسمہ لے کر عیسائی ہوتے ہیں، حلف اٹھاتے ہوئے انجیل مقدس پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ لیکن کسی نے کبھی یورپی یونین کو طعنہ نہیں دیا کہ کہاں تھے تمہارے عیسائی حکمران اور عیسائی ملّت، جب آرمینیا کے عیسائی، مسلمانوں سے لڑ رہے تھے؟ مسلمان حکمرانوں کا یورپی ممالک کے حکمرانوں میں سے کسی بھی سیکولر، لبرل حکمران سے موازنہ کر لیں آپ کو دونوں اپنی طرزِ زندگی میں مختلف نظر نہیں آئیں گے۔ بےنظیر، نواز شریف، زرداری، مشرف اور عمران خان کی زندگیوں کو لے لیں اور جرمنی کی انجیلا مرکل، فرانس کے میکرون، برطانیہ کے بورس جانسن اور سپین کے جنرل فرانکو، ان کی بود و باش کا مطالعہ کر لیں، آپ ان کے نام بدل دیں، مذہب تبدیل کر دیں، آپ کو ان کی باقی تمام طرزِ زندگی، اخلاقیات، معاشرت، معاشیات اور خاندانی زندگی غرضکسی میں بھی فرق نظر نہیں آئے گا۔ پچاس سے زیادہ وہ ممالک جہاں مسلمان اکثریت سے رہتے ہوں، ان کے آئین، وہاں نافذ قوانین، معیشت میں سودی بینکاری کی بالادستی، نظامِ تعلیم کی سیکولر بنیادیں، اللہ کی بجائے انسانوں کی حاکمیت، خواہ ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے ہو یا الیکشن کے ذریعے، ان تمام معاملات میں بھی ان میں اور یورپ کے دیگر ممالک میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ آپ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دیگر ممالک کے آئین اٹھائیں اور پھر ان ممالک کے آئین اٹھائیں، جہاں مسلمان اکثریت میں

ہیں، دونوں کا شق وار مطالعہ کریں، آپ کو چند ایک دفعات کے علاوہ کہیں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

مسیحی یورپ کے سیکولر، لبرل حکمرانوں کی اسرائیل کی حکومت کے سامنے بے بسی اور لاچاری بھی ہم سے مختلف نہیں ہے۔ ان ملکوں میں بسنے والے عیسائیوں کے تمام مقدس مقامات یروشلم میں ہیں اور یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ یورپ کا ایک عام شہری جب ان مقامات کی زیارت کے لیے جاتا ہے، جہاں سیدنا عیسیٰؑ پیدا ہوئے، جہاں پلے بڑھے، جس پہاڑی پر کھڑے ہوکر وہ وعظ کرتے تھے اور جن گلیوں سے صلیب لے کر گزرے تھے، تو وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے کہ ٹورسٹ گائیڈ سیاحوں کو ایک ایسی تاریخ سنا رہا ہوتا ہے، جس کے خلاف پوری عیسائی دنیا دو ہزار سال تک یہودیوں سے لڑتی رہی۔ اسرائیل میں تقریباً دو لاکھ عیسائی آباد ہیں جن کی اکثریت یروشلم میں ہے، لیکن انہیں اپنے مقدس مقامات پر اتنا بھی اختیار حاصل نہیں کہ اپنی مرضی سے اسے آراستہ کرسکیں۔ آٹھ سال پہلے ان کے مقدس ترین مقام ''نیٹویٹی'' (Nativity) چرچ میں جس طرح قتل عام کیا گیا، اسے خون میں نہلا دیا گیا، اس سانحہ پر عیسائی اکثریت کے یورپی ممالک کے سیکولر، لبرل حکمران اس ظلم پر اتنی بھی آواز نہ اٹھا سکے، جتنی مسلمان اکثریتی ممالک کے سیکولر، لبرل حکمران آج اٹھا رہے ہیں۔

اسی طرح جب کشمیر، فلسطین، روہنگیا وغیرہ میں مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے تو سیکولر، لبرل گروہ ایک اور طعنہ دیتا ہے، کہاں ہے اسلامی کانفرنس (OIC)؟ دنیا میں اسلامی کانفرنس کی طرح کی لاتعداد علاقائی تنظیمیں موجود ہیں اور یہ سب کی سب اسلامی کانفرنس کی طرح ہی مردہ اور بے کار ہیں۔ ان میں کئی علاقائی تنظیموں کا پاکستان رُکن بھی ہے۔ کبھی کسی نے سوال اٹھایا کہ ''سارک'' جس کے ممبران بھارت اور پاکستان ہیں، وہ کشمیر میں ظلم کیوں نہیں رکواتی؟ افریقین یونین اس وقت کہاں تھی جب اس کے صدر قذافی کے ملک پر ظلم ہو رہا تھا؟ یورپی یونین بوسنیا میں دس سال مسلمانوں کا قتل عام دیکھتی رہی، آرگنائزیشن آف امریکن سٹیٹس چلّی سے لے کر گرانیڈا تک امریکہ کی جارحیت برداشت کرتی رہی اور شنگھائی کارپوریشن میں بھی تو بھارت اور پاکستان دونوں شامل ہیں، وہ کشمیر میں ظلم کیوں نہیں رکواتی؟ ان تمام تنظیموں سے سوال اس لیے نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ اپنے وجود کے اعتبار سے بھی سیکولر ہیں اور نام کے اعتبار سے بھی۔ آج اگر اسلامی کانفرنس کا نام بدل کر تنظیم برائے شمالی افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، جنوبی ایشیا و مشرق بعید رکھ دیا جائے تو ہر سیکولر، لبرل دانشور ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جائے گا۔

اس سیکولر، لبرل گروہ کی ایک اور منافقت بھی ہے۔ یہ فلسطین اور کشمیر پر صرف طعنہ دینے کے لیے ''اُمت'' کا نام لیتا ہے، لیکن اس گروہ نے کبھی یہ سوال نہیں کیا، کہ کہاں تھی مسلم اُمّہ جب روس افغانستان میں داخل ہوا، امریکہ اور اس کے اڑتالیس حواری ممالک نے افغانستان پر حملہ کر دیا، عالمی طاقتیں عراق میں گھس گئیں، پندرہ لاکھ لوگ قتل کر دیئے۔ یہ سیکولر طبقہ ہمیشہ ان ظالم عالمی طاقتوں کی حمایت میں کھڑا ہوتا رہا ہے، اور ایسے تمام مسلمان جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ان علاقوں کے مظلوموں کے لیے لڑنے جاتے تھے تو انہیں دہشت گرد، فسادی، شدت پسند کہہ کر نہ صرف بدنام کرتا اور انہیں گرفتار بھی کرواتا رہا ہے۔ یہ طبقہ اس قدر ظالم ہے کہ اگر کوئی ان ملکوں کے مظلوموں، مہاجروں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد بھی کرنا چاہے تو ان پر عرصۂ حیات تنگ کرواتا ہے اور پوری کوشش کرتا ہے کہ شام، افغانستان اور عراق کے جنگ زدہ مہاجروں، یتیموں اور بیواؤں تک امداد نہ پہنچ سکے۔ یہ ہے وہ روّیہ جو مسلمان اکثریتی ممالک کے سیکولر حکمرانوں کا بھی ہے اور ان دانشوروں کا بھی جن کے روبرو آج بیت المقدس میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ رمضان میں ان پر فائرنگ ہوئی اور اب اس وقت اسرائیل اور فلسطینی آبادی کے درمیان جنگ جاری ہے۔ فلسطینی مسلمان گذشتہ ستر سال سے یہ جنگ لڑتے چلے آرہے ہیں۔ ان ستر سالوں میں کم از کم پچاس سال، فلسطینیوں کی یہ جنگ صرف ایک قوم پرست جنگ کے طور پر لڑی جس میں جارج بش جیسے عیسائی رہنما بھی شریک تھے، لیکن مسلمان کثریتی ممالک کے سیکولر حکمرانوں نے اس وقت بھی ان کا کھل کر ساتھ نہیں دیا تھا کیونکہ یہ حکمران امریکہ اور سوویت یونین کی جھولیوں میں بیٹھے مصلحت کی نیند سو رہے تھے اور آج بھی ان کا یہی عالم ہے۔ برونائی سے لے کر مراکش تک اس مسلم اکثریتی علاقے کے پاس کم از کم نصف کروڑ مسلح افواج ہیں اور ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ایٹم بم ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ ارب مسلمان ایسے ہیں جن کی اکثریت جذبۂ جہاد سے سرشار ہے۔ اس صورت میں طعنہ زن سیکولر، لبرل گروہوں سے میری ایک درخواست ہے: آپ ان تمام مسلم اکثریتی ممالک کے سیکولر حکمرانوں سے کہیں کہ وہ ایک اعلان کر دیں، کہ جس کسی نے بھی فلسطین جا کر اسرائیل سے لڑنا ہے، اس کے لیے تمام بارڈرز کھلے ہیں۔ حکومت کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی، بلکہ انہیں تمام ممالک راستہ دیں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ صرف ایک دن میں اس مسلم اُمہّ کا وہ چہرہ نظر آجائے گا جو ہر مسلمان کے دل میں دھڑکتا ہے جس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، ''مسلمان جسد واحد ہیں، ایک عضو کو تکلیف ہو تو دوسرا تڑپنے لگ جاتا ہے''۔

خودنوشت　　مدیر

# 'مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا' (۲)

## کرونا کی تکلیف وتجربات

اپریل ۲۰۲۱ء/ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ میں پاکستان میں کرونا کی تیسری لہر آئی جو زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔ مَیں احتیاط بھی کر رہا تھا اور ویکسینیشن بھی کرائی لیکن ویکسینیشن کی دوسری ڈوز کے ایک ہفتہ بعد جکڑا گیا اور اگلا ایک مہینہ سخت اذیت میں گزرا۔ اس دوران اگر طبیعت کسی وقت سنبھل جاتی تو عادت سے مجبور ہو کر کچھ لکھ بھی لیتا۔ اسی کی تبییض حاضر خدمت ہے۔

## کرونا۔ تین بیماریوں اور اذیتوں کا مجموعہ

بیماری جو بھی ہو تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتی ہے لیکن کرونا میں تین بیماریاں جمع ہو گئی ہیں جنہوں نے تکلیف کو بہت بڑھا دیا ہے۔ ایک تو ہے کرونا: بخار، کھانسی، جسم میں درد، بے چینی اور شدید کمزوری۔ اس کی ابتداء نزلہ زکام کی علامتوں سے ہوئی اور پھیپھڑوں کے نمونیے تک لے گئی۔ سانس ناہموار ہوئی تو بیٹے گھر میں آکسیجن سلنڈر لے آئے۔ زیادہ تکلیف کا خدشہ ہوا تو ہسپتال میں داخل کرا دیا لیکن الحمدللہ طبیعت بہتر رہی تو تین دن بعد واپس آ گیا اور آکسیجن کی ضرورت بھی نہ رہی۔

اس بیماری سے بڑی اذیت تھی قید تنہائی کی جسے میڈیکل والے قرنطینہ کہتے ہیں یعنی مریض اکیلا الگ تھلگ کمرے میں رہے۔ میں نے تو تین ہفتے تک تنہائی کی یہ اذیت سہی لیکن اس احتیاط کا زیادہ فائدہ نہ ہوا کیونکہ میری خدمت کرنے والے دونوں بیٹے کرونا کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان کی وجہ سے ان کی بیویاں اور بچے بھی متاثر ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس مرض میں بچے زیادہ متاثر نہیں ہوتے اور بیٹے بھی ماشاء اللہ چونکہ جوان اور صحت مند تھے اس لیے ان کی تکلیف بھی قابل برداشت رہی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جلد صحت دی۔ اہلیہ بہرحال اس مشکل وقت میں یاد آتی رہیں (جن کا پچھلے سال ۲۸ جولائی ۲۰۲۰ء کو انتقال ہو گیا تھا) کہ اگر وہ زندہ ہوتیں تو بہت خدمت کرتیں اور شاید تکلیف زیادہ محسوس نہ ہوتی۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر جس نے نیک

اور خدمت کرنے والی اولاد دی ہے۔

تیسری بیماری جس نے اس اذیت کو بڑھادیا وہ ہے پڑھنے لکھنے اور چوبیس گھنٹے خود کو مصروف رکھنے کی عادت۔ بیماری، تکلیف، کام کرنے کی سکت ندارد، چوبیس گھنٹے گزریں تو کیسے گزریں؟ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں۔ غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ زندگی بھر جدو جہد کی۔ خود کو بہت مصروف رکھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے زندگی میں دینی ودنیاوی لحاظ سے جو کچھ حاصل کیا اسی جذبے اور محنت کا نتیجہ ہے۔ غرض یہ کہ کرونا، تنہائی اور کام نہ کرسکنے کی کیفیت نے اس بیماری کو سہ آتشہ بنادیا ہے۔

### ڈپریشن سے بچنا

'صبر کرو' کہنا آسان ہے لیکن اس پر عمل مشکل لہٰذا ان حالات میں، عارضی طور پر سہی، ڈپریشن، مایوسی اور بے چینی (Anxiety) کے وقفے آتے رہے اور زندگی میں پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ جذباتی ہیجان (Panic) کی اس کیفیت سے نکلنے کے لیے میں نے کچھ ٹپس (Tips) وضع کر رکھی ہیں:

۱۔ 'یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ' کا ورد کثرت سے کرتا ہوں اور صرف اسی حالت میں کرتا ہوں، عام حالات میں نہیں کرتا۔ گویا یہ ورد میں نے اسی غرض سے آخری علاج کے طور پر بچا کر رکھا ہوا ہے۔

۲۔ اونچی آواز میں اللہ کو مدد کے لیے پکارنے لگتا ہوں: یااللہ رحم فرما! یااللہ فضل فرما! یااللہ صبر دے! یااللہ تکلیف دور فرما اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہوں۔

۳۔ شدید غم اور شدید تکلیف میں رو لینا بھی مفید ہے۔ یہ نہ بزدلی ہے نہ صبر کے خلاف بلکہ جذبات کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ اس سے نفسیاتی طور پر کتھارسس ہوجاتا ہے، جذبات کی نکاسی ہوجاتی ہے اور آدمی قدرے پرسکون ہوجاتا ہے۔

۴۔ ہلکا پھلکا مطالعہ جیسے کسی ڈائجسٹ سے جاسوسی کہانیاں پڑھنا وغیرہ۔

### بیماری اور ڈپریشن کے باوجود کام

یہ عادت بھی خود کو برسوں کی مشقت سے ڈالی ہوئی ہے کہ صدمے اور ڈپریشن کے وقفے کو

عارضی رکھتا ہوں اور جلد اس کیفیت سے نکل کر خاطر جمعی کے ساتھ کسی تعمیری کام میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ مطالعہ کے علاوہ، جو دن رات چلتا ہی رہتا ہے، میری عادت ہے کہ لکھنے کے دو تین کام ہر وقت پیش نظر رکھتا ہوں۔ البرہان کی وجہ سے تازہ دینی حالات وواقعات کا تجزیہ۔ تعلیم و تزکیہ، مغربی تہذیب اور غلبہ دین کے موضوع پر کسی نہ کسی تالیف پر کام کر رہا ہوتا ہوں اور کچھ مستقبل کے کسی تحریری منصوبے کے لیے مواد جمع کر رہا ہوتا اور مطالعہ کر رہا ہوتا ہوں۔ لہٰذا جب بھی بیماری یا صدمے کی شدید کیفیت نہ ہو تو ان کاموں میں سے کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ چنانچہ بیماری کی اس حالت میں مئی کا البرہان فائنل کیا۔ ''اسلام اور تعمیر سیرت'' کے عنوان سے زیر تسوید کتاب کے آخری باب کی تکمیل کی اور یہ یادداشتیں لکھیں۔ فللّٰہ الحمدللہ والمنّہ۔

## آخری عمر کی عبادت

تقرب الی اللہ، عبادت ونوافل وذکر کی کثرت اور عبادت کی لذت کس مسلمان کی آرزو نہیں ہوتی؟ اپنی بھی عمر بھی یہی کیفیت رہی کہ ؎

احب الصالحین ولستُ منہم
لعلی اللّٰہ یرزقنی صلاحًا

یعنی میں صالح تو نہیں ہوں لیکن صالحین سے محبت ضرور کرتا ہوں شاید اس طرح اللہ تعالیٰ میری بھی اصلاح فرمادیں۔

ہم میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ جوانی اور صحت کا زمانہ دوسری دنیاوی یا دینی سرگرمیوں میں گزرتا جاتا ہے اور آدمی توقع کرتا ہے کہ بڑھاپے میں دل نرم ہوجائے گا، دوسری سرگرمیاں کم ہوجائیں گی تو آدمی خضوع وخشوع سے زیادہ عبادت کرسکے گا۔ چلو ٹوٹے پھوٹے ہی سہی فرائض وواجبات تو ادا کر ہی رہا ہوں۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عبادت وذکر وغیرہ کے جو معمول عمر بھر بن جائیں، آخری عمر میں جاکے ان میں اضافہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور یہ بالعموم نہیں ہو پاتا بلکہ بیماری اور کمزوری میں معمول کی عبادت بھی نہیں ہو پاتی۔

اس بات پر تنبیہ ضروری ہے بلکہ بہت ضروری ہے کیونکہ ہر مسلمان کی آخری غایت تو یہی ہوتی ہے کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہوجائے اور آخرت میں اس کی خوشنودی اور اس کی نعمتیں حاصل ہوجائیں۔

دنیا میں آخرت کے اس مطلوبہ ہدف کو مرکز نگاہ و مرکز جدوجہد نہ بنانا خسارۂ دین و دنیا ہے، اگرچہ بظاہر زندگی کامیاب ہی ہو۔ میں نے بچپن سے مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا تصوف مخالف لٹریچر پڑھا اور جماعت اسلامی کی تربیت میں زندگی گزاری جس سے طبیعت میں گداز کا مادہ ماند پڑ گیا۔ لیکن جماعت سے الگ ہو کر بھی اتنی طویل شعوری زندگی گزاری ہے کہ جماعت کی تربیت کو دوش نہیں دے سکتا۔ فکری انقلاب بھی واقع ہوا اور تربیت و تزکیہ و اصلاح کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی۔ اس کے لیے عملی کوششیں بھی کیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب آسرا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے کہ چلیے کوشش تو کی۔ وہ چاہے تو قبول فرمالے ؂

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

سبق اس میں میری اولاد، متعلقین اور قارئین کے لیے یہ ہے کہ تقرب الیٰ اللہ کے لیے کثرت ذکر و عبادت کو آج معمول بناؤ۔ اسے بڑھاپے اور فرصت کے لیے نہ چھوڑو۔ بیماری اور بڑھاپے میں تو فرائض و واجبات بھی ادا نہیں ہو پاتے چہ جائیکہ آدمی کثرت عبادت و ذکر کا سوچے۔

## کرونا میں تفویض الی اللہ

اسلام کے اصول بڑے سادہ، سنہری اور قابل عمل ہیں لیکن ہم اپنی بدقسمتی، بے عقلی اور غلط تعلیم و تربیت سے ان پر عمل نہیں کر پاتے۔ ان میں سے ایک سنہری اصول تفویض الی اللہ کا ہے[1] یعنی جن امور میں نتائج ہمارے بس میں نہیں وہاں اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو خوش دلی سے قبول کیا جائے۔ بلکہ جہاں انسانی جدوجہد مطلوب ہو وہاں بھی محنت کر کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیے جائیں تو انسان خوشی اور اطمینان کی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری زندگی کے چند تجربات اور واقعات:

* میرا خاندان ضلع گجرات میں کھاریاں کینٹ کے قریب 'بوریانوالی' گاؤں میں مقیم تھا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ اس وقت تک الٹرا ساؤنڈ کا موجودہ نظام جس میں پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ بیٹی ہوگی یا بیٹا، موجود نہ تھا بلکہ دائی ہی ولادت کے وقت بتاتی تھی۔ میری امی نے مجھے بتایا کہ تمہاری بھابھی[2] کے ہاں پانچویں بیٹی ہوئی ہے اور وہ ذرا آزردہ ہے، تم بھی ہو آؤ۔ میں غالباً اس وقت جہلم میں آئی کام کا طالب علم تھا۔ مَیں بھائی کے کمرے میں گیا بچی کو پیار کیا اور بیٹھ

---

[1] ﴿وَأُفَوِّضُ أَمْرِيَ إِلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ [غافر ۴۰:۴۴]

[2] چند سال پہلے ان کا وضو کرتے ہوئے انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں۔

گیا.... یاد رہے کہ میری بھابھی میرے ننھیال سے تھیں اور 'اہل سنت' مسلک رکھتی تھیں لیکن گاؤں کی اکثریت چونکہ اہل حدیثوں کی تھی لہٰذا ماحول پر ان کا خاصا اثر تھا۔ گویا وہ بھی موحدہ تھیں اور اولادِ نرینہ کے لیے پیروں فقیروں اور عاملوں کے پاس جانا جہالت سمجھتی تھیں۔ مَیں ان کی تسلی دلاسے کی باتیں کرتا رہا۔ جب مَیں اٹھنے لگا تو مَیں نے کہا بھابھی! آپ جانتی ہیں مَیں سب سے چھوٹا ہوں اور آپ سے بھی کافی چھوٹا ہوں لیکن میرے دل میں ایک بات آئی ہے، اگر آپ بُرا نہ منائیں تو کہوں؟ کہنے لگیں: کہو۔ مَیں نے کہا کہ کسی ماں کا اولادِ نرینہ کی خواہش رکھنا بالکل فطری ہے۔ آپ ہر دفعہ ۹ مہینے تک بیٹے کی آس رکھتی ہیں اور بیٹی ہونے پر آپ کی آس ٹوٹ جاتی ہے اور آپ کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اب آپ میرے کہنے پر ناکامی اور مایوسی کو قبول کر لیں اور بیٹے کی توقع کرنا چھوڑ دیں بلکہ اللہ سے بیٹے کی دعا مانگنا بھی چھوڑ دیں اور یہ کہا کریں کہ: اے اللہ! مَیں آپ کی مشیت اور آپ کے فیصلوں پر راضی ہوں۔ آپ اگر مجھے دس بیٹیاں بھی دے دیں تو مَیں پھر بھی راضی ہوں۔ آپ میری اولاد کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں، مَیں اس پر خوش ہوں۔

کہنے لگیں: اس سے کیا ہوگا؟ مَیں نے کہا: اگر آپ نے دل سے اس بات کو قبول کر لیا اور اس پر عمل کیا تو میرا وجدان کہتا ہے کہ اللہ آپ کو بیٹا دے گا۔ اس کے پاس بیٹوں کی کمی تھوڑی ہے؟ کہنے لگیں: اچھا، مَیں ایسے ہی کروں گی.... اور اگلے سال اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹے سے نواز دیا۔

* مَیں نے جماعت اسلامی میں ایک ہی صوفی دیکھا ہے (ممکن ہے اور بھی ہوں لیکن میں تو اپنے علم کی حد تک کہہ رہا ہوں) اور ہمیشہ اس جمع بین الاضداد پر حیران ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب (اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ چند سال پہلے لاہور میں فوت ہوئے)۔ انہوں نے طائف میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا۔ حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ سے بیعت تھے۔ کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ وہ مستجاب الدعاء ہیں۔ جماعت اسلامی کے الیکشن میں ہارنے پر (غالباً ۱۹۸۵ء میں) ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی کے مدیر شہیر جناب صلاح الدین صاحب [1] سے ڈاکٹر صاحب کا تحریری مناقشہ شروع ہو گیا جس میں تلخی آ گئی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت نے انہیں مباہلے کا چیلنج دے دیا۔ مَیں یہ جان کر مضطرب ہوا۔ اس وقت ٹیلیفون اور موبائل کی سہولت اس طرح موجود نہ تھی جیسی آج ہے۔ مَیں انہیں خبردار کرنا چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے ہرگز مباہلہ نہ کریں لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ 'تکبیر' کا اگلا شمارہ آیا

---

[1] اللہ تعالیٰ جنت الفردوس عطا فرمائیں۔ راقم کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔

تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ صلاح الدین صاحب نے املے سے کام لیا اور لکھا کہ ڈاکٹر صاحب! ہم دونوں جماعت کے خیر خواہ ہیں اور دینی مقاصد کے لیے اسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ بس طریق کار پر اگر تھوڑا بہت اختلاف رائے ہو تو اس پر افہام وتفہیم سے کام لینا چاہیے۔ (بعد میں صلاح الدین صاحب نے مجھے بتایا کہ انہیں سعودی عرب سے کئی ٹیلیفون آئے کہ ڈاکٹر صاحب سے ہر گز مباہلہ نہ کرنا وہ مستجاب الدعاء ہیں)۔

ڈاکٹر صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد جب مستقل لاہور آ گئے تو کچھ عرصہ منصورہ میں فری ڈسپنسری کھول لی۔ میری ان سے کئی دفعہ ریاض اور جدہ میں جماعت اسلامی کے حلقے میں ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ کچھ عرصہ سعودی عرب کی جماعت اسلامی کے امیر تھے اور بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح ڈاکٹر صاحب سے اپنے مشن کے لیے خصوصی دعا کراؤں۔ مَیں نے پلاننگ کے ساتھ کوشش کی کہ ان سے ذرا قربت بڑھے۔ جب مَیں نے گنجائش دیکھی تو ایک دن کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہفتے میں کسی دن اپنی سہولت سے آدھ گھنٹہ عنایت فرما دیں۔ کہنے لگے: میرے پاس کیا ہے؟ صرف کچھ عرصہ بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ بہرحال کچھ پس وپیش کے بعد وقت طے ہو گیا اور مَیں جمعرات کے دن عصر تا مغرب ان کے دولت خانے پر ماڈل ٹاؤن میں حاضری دیتا۔ حالانکہ ان کی اہلیہ فوت ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود چائے بسکٹ کا خصوصی اہتمام فرماتے۔

کچھ نشستوں کے بعد ایک دن مَیں نے کہا: حضرت آپ میرے لیے خصوصی دعا فرمائیں۔ کہنے لگے کیا مسئلہ ہے؟ مَیں نے کہا: ربع صدی ہو گئی محنت کرتے ہوئے نتیجہ نہیں نکلتا۔ تفصیل پوچھی۔ مَیں نے سارے حالات عرض کیے کہ سعودی عرب سے واپسی پر (۱۹۸۶ء میں) یہ سوچا تھا کہ اگر نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح ہو جائے اور نسل نو کی تربیت کا نظام صحیح اسلامی خطوط پر استوار ہو جائے تو چلیے صحیح سمت میں قدم اٹھنا شروع ہو جاتے، دین کا بھی فائدہ ہوتا اور مسلمانوں کا بھی لیکن کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ حکومت کو اس کام سے دلچسپی نہیں کہ امریکہ بہادر کا ڈر ہے۔ مذہبی فرقہ واریت اور تحزب زوروں پر ہے۔ ہر عالم ''حق'' کو اپنے مسلک ومشرب اور مکتب فکر تک محدود سمجھتا ہے اور جو اس سے باہر ہو معاشرے میں اس کے فکر وعمل کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ مدارس بھی اپنے ڈھرے سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ جدید تعلیم کاروبار بن گئی ہے اور لوگ کروڑوں اربوں روپے تعلیم کے شعبے میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں لیکن تعلیم وتربیت کے اسلامی

تصور پر عمل کرنے کو کوئی تیار نہیں۔ دینی جماعتوں کو بھی اس میں دلچسپی نہیں اور ان کے لوگوں نے بھی اسے کاروبار بنالیا ہے۔ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ کم از کم ایک مدرسہ،سکول، کالج اور یونیورسٹی بطور ماڈل صحیح خطوط پر کام کرنے لگے تاکہ دوسروں کے لیے نمونہ اور انسپائریشن کا سبب بنے لیکن قوم کا کوئی طبقہ ساتھ دینے کو تیار نہیں۔

مَیں بولتا رہا اور وہ سنتے رہے۔جب مَیں نے بات مکمل کر لی تو ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کیا فرماتے ہیں۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر صاحب پٹھان تھے،سرخ وسفید رنگ، اونچا قد، بھاری آواز اچانک ڈاکٹر صاحب کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا اور پھر یوں لگا جیسے وہ پھٹ پڑے ہوں۔اونچی آواز میں کہنے لگے:تم خدا ہو؟تم خدا بننا چاہتے ہو؟تم خدا سے اپنی مرضی کے فیصلے لینے پر اصرار کرتے ہو؟....مَیں تو ان کے جلال سے ڈر گیا لیکن وہ کافی دیر اس پر بولتے رہے۔مَیں چپ کا چپ رہ گیا۔سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ردّعمل دوں۔جب مَیں واپسی کے لیے اٹھا تو کہنے لگے، مَیں تو تمہیں سیانا آدمی سمجھتا تھا۔ارے بھلے مانس!بندے کا کام محنت کرنا ہے،نتائج اوپر والے کے ہاتھ میں ہیں۔جو چیز تمہارے بس میں ہی نہیں اس پر قلق کیسا؟تم خدا سے اپنی مرضی کے نتائج لینے پر اصرار کرنے کی بجائے یہ کیوں نہیں کرتے کہ اس کی رضا پر اور اس کے فیصلوں پر راضی ہو جاؤ؟مَیں اٹھ کے آ گیا اور دوبارہ ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

* وقت گزرتا رہا۔مَیں محنت کرتا رہا اور ناکامیوں کا منہ دیکھتا رہا۔مَیں کبھی اپنے اللہ سے مایوس نہیں ہوا اور ہمیشہ اس سے توفیق طلب کرتا رہا اور محنت کرتا رہا لیکن پوری شعوری مزاحمت کے باوجود چھوٹی چھوٹی ناکامیاں جمع ہو کر ڈھیر بنتی گئیں اور قلق واضطراب کے تسلسل نے اعصاب کو توڑنا شروع کیا اور Anxiety کے دورے پڑنے لگے۔

یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے مَیں اپنے حالات پر پریشان غور کر رہا تھا کہ اچانک ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحبؒ یاد آ گئے اور ان کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔رات ہوئی تو مَیں نے مصلّٰی سنبھالا اور لگا بلکنے:اے اللہ!مجھے معاف فرما دیجیے۔مَیں قصوروار ہوں۔مَیں مانگتا تو آپ ہی سے رہا لیکن اصرار تو اپنی خواہشات کے پورا ہونے پر تھا،اگرچہ وہ خواہشات دینی ہی تھیں۔مَیں نے کہا:اے اللہ جی!مَیں آپ کی رضا پر اور آپ کے فیصلوں پر راضی ہوں۔اگر آپ کو منظور نہیں تو مجھ کو بھی منظور نہیں۔مَیں آج کے بعد آپ سے اپنی دینی خواہشات پوری ہونے کی دعا بھی نہیں

مانگوں گا۔ مَیں آپ سے صرف آپ کی رضا مانگتا ہوں اور صرف وہی مانگتا رہوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نبوی دعا "رضیت باللّٰہ ربًا وبالاسلام دینًا وبمحمدٍ نبیًا والقدر خیر وشرہ من اللّٰہ تعالٰی والبعث بعد الموت" [1] اٹھتے بیٹھتے شروع کر دی۔ چند دن نہ گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کشادگی کی ایک صورت پیدا فرما دی۔ اللّٰہ اکبر کبیرًا وسبحوہ بکرۃ واصیلًا اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے پیش نظر دینی کاموں کے لیے مزید غیب سے مدد فرمائیں گے۔

* اور پچھلے ماہ مجھے کرونا نے آ جکڑا۔ ٹیسٹ ریزلٹ پازیٹو آیا تو مجھے یقین نہ آیا، توقع ہی نہ تھی۔ مَیں اسے روٹین کا زکام سمجھتا رہا جو مجھے الرجی کی وجہ سے ہوتا رہتا ہے۔ رات ہوئی تو مَیں نے مصلیٰ سنبھالا اور کہا اللہ جی! مَیں آپ کی رضا پر اور آپ کے فیصلوں پر راضی ہوں۔ میری زندگی اور میری موت، ظاہر ہے، میرے ہاتھ میں نہیں آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ نے میری موت اس وبا میں رکھی ہے تو مَیں اس کے لیے تیار ہوں۔ مَیں اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔ میں آپ کی رضا پر اور آپ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اور اگر آپ نے میری موت اس وبا میں نہیں لکھی تو مجھے ایمان اور صحت والی زندگی عطا فرمائیے تا کہ جب تک زندہ رہوں اپنی مغفرت کے لیے اور آپ کے دین کی نصرت کے لیے حسب استطاعت ٹوٹا پھوٹا لگا رہوں اور اسی حالت میں موت آ جائے۔ چنانچہ مَیں نے کرونا میں اپنے لیے صحت کی دعا نہ کی بلکہ اس کے فیصلے پر راضی رہنے کی بات دہراتا رہا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ جب دیکھا کہ (اللہ کے فیصلے کی وجہ سے) روبصحت ہوں تو پھر صحت عاجلہ وشاملہ کی دعا بھی کرنے لگا کہ اس کے علاوہ کون ہے جس سے مانگا جائے؟ اور اس کے سوا کون ہے جو کسی کو کچھ دے سکتا ہے؟

حاصل یہ کہ دنیا میں خوشی، اطمینان اور کامیابی کی کلید ہے اللہ کی رضا پر راضی رہنا اور اس سے راضی ہو جانا اور اس سے اپنی منوانے کی بجائے اس کی ماننا۔ اور یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں، نہ کوئی میری منفرد تحقیق ہے۔ یہ تو ایک سادہ سا دینی اصول ہے جس پر عمل کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[1] "میں اس پر راضی ہوں کہ اللہ میرا رب ہے، اسلام میرا دین ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے نبی ہیں، اچھی اور بُری تقدیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور میں آخرت میں یقین رکھتا ہوں۔" (صحیح مسلم: ۵۸۱)

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

# مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار و آراء
## ایک مختصر مگر جامع تجزیہ

### مغرب اور اسلام کا تصور خیر اور حق

یہاں میں اختصار کے ساتھ مغربی مفکرین کے حوالے سے اس تصورِ حق (Right) اور تصورِ خیر (Good) کی وضاحت پیش کروں گا جس تصورِ حق اور تصورِ خیر پر سرمایہ داری اور جمہوریت قائم ہیں۔ میں ان کے مفکرین کے اساسی تصورات اور فکر پیش کروں گا۔ اس جائزے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام کے تصورِ حق و خیر اور مغرب کے تصورِ حق و خیر میں کسی قسم کی کوئی مماثلت نہیں ہے اور دونوں نظام ہائے حق و خیر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے مابین کسی قسم کا مکالمہ ممکن نہیں۔ اس وقت کرنے کا کام یہی ہے کہ ان مغربی مفکرین اور فلاسفہ کا اسلامی محاکمہ پیش کریں جن کے نظریات پر مغربی تہذیب، اس کا فلسفہ اور اس کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ لہٰذا علماء اور طلبہ کی توجہ کے لیے بڑے بڑے مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے حوالے سے چند عمومی باتیں مختصراً پیش کی جا رہی ہیں۔

### تصور ذات (Self)

کسی بھی نظامِ فکر میں سب سے بنیادی مسئلہ تصور ذات یعنی Self کا مسئلہ ہے۔ میں مغرب کی اصطلاحات ہی استعمال کروں گا۔ Self کو Self ہی کہوں گا ذات نہیں کہوں گا اور دوسرے تصورات بھی انہی کی اصطلاح میں بیان کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً مجھے ان کا ترجمہ معلوم نہیں، دوسرے یہ کہ تصورات (Concepts) کا ترجمہ پیش کرنا ایک نہایت مشکل کام ہے۔ مثلاً حیا کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں کیا جاسکتا یا غیرت کا کوئی ترجمہ انگریزی میں نہیں کیا جاسکتا۔ انہی معنوں میں مَیں سمجھتا ہوں کہ Self کا کوئی ترجمہ ممکن نہیں۔ جیسے Ontology کا کوئی ترجمہ ہمارے ہاں بہت مشکل ہے۔ یہ علمائے کرام ہی کا کام ہے کہ ان مغربی تصورات کا اسلامی محاکمہ کریں اور واضح کریں کہ اسلامی علوم میں ان کی کیا حیثیت ہے؟

گفتگو کا محور بیسویں صدی کا فلسفہ ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے فلسفہ میں تصورِ فرد (Theory of Self) یا تصورِ ذات کو سمجھنے کے لیے چند اجمالی باتیں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نمایاں فلسفیوں کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں مغرب میں کوئی صف اوّل کا مابعد الطبیعیات دان (Metaphysician) پیدا نہیں ہوا ہے۔ یا کم از کم میری ناقص رائے میں ایسا ہی ہے۔ مغرب فکری طور پر (Intellectually) بانجھ ہے، بالخصوص الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے دائرے میں بیسویں صدی میں مغرب میں کوئی بنیادی کام نہیں ہوا ہے۔ بنیادی طور پر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مفکرین کے کام پر نئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ بات مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات دونوں شعبوں کے بارے میں بلا خوف کہی جاسکتی ہے۔

اٹھارویں صدی میں جس فکر نے عیسائیت کو شکست دی اس کی دو شاخیں تھیں:

۱۔ تحریک تنویر (Enlightenment)

۲۔ تحریک رومانویت (Romanticism)

یہ دونوں تحریکیں مغربی تہذیب کی روح رواں ہیں۔ مغربی تہذیب کے بنیادی آدرش انہی تحریکوں سے حاصل ہوتے ہیں اور مغربی تہذیب کے بنیادی تصورات، عقائد و افکار و نظریات فی الحقیقت تحریک تنویر اور تحریک رومانویت ہی سے نکلے ہیں۔

## تحریک تنویر کی علمیات

یہ دونوں تحریکیں بنیادی طور پر وحی کا انکار کرتی ہیں۔ انہی معنوں میں یہ عیسائیت کا بھی انکار ہیں۔ پروٹسٹنٹ (Protestantism) عیسائیت نے اس انکار کا اولین جواز فراہم کیا تھا۔ پروٹسٹنٹ ازم کا بانی لوتھر کفر کے غلبہ کے سلسلہ میں اصل مجرم ہے۔ عقل انسانی کو وحی کی تعبیر اور تفسیر کا واحد ذریعہ قرار دے کر اور اجماع کی حجیت کو رد کر کے اس نے انکار وحی کی تحریکوں کے لیے زمین ہموار کی۔ اس نے عیسائی تناظر میں وحی کے انکار کی عمومی قبولیت کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔ وحی کے انکار سے مراد کیا ہے؟ وحی کے انکار سے مراد یہ ہے کہ عقل استقرائی (Inductive Reason) اور عقل استخراجی (Deductive Reason) کو استعمال کر کے

حقیقت (Ontology) تک رسائی ہوسکتی ہے۔عقل وحی اور علم لدنی کے بغیر ان سوالات کا جواب دے سکتی ہے کہ انسان کیا ہے، انسان کی کائنات میں حیثیت کیا ہے؟ وغیرہ.... یہ Ontological سوالات ہیں۔عیسائیت یہ کہتی تھی کہ ان Ontological سوالات کا جواب وحی کے بغیر نہیں دیا جاسکتا۔اسلام بھی یہی کہتا ہے لیکن تحریک تنویر اس بات کی داعی ہے کہ ان سوالات کا شافی وکافی جواب انسانی عقل کے ذریعہ مل سکتا ہے۔اس کے لیے کسی ماورائی ذریعۂ علم کی ضرورت نہیں ہے۔جس طریقہ سے عقل کو استعمال کرتے ہوئے ریاضی اور منطق کے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں اسی طریقہ سے عقل کو استعمال کرکے مابعد الطبیعیاتی حقائق اور حقیقت انسانی وکائنات کے بارے میں مسائل بھی حل کیے جاسکتے ہیں۔

## بنیادی ذریعۂ علم عقل ہے

یہ تحریک تنویر کی علمیات (Epistemology) ہے۔اس علمیات کے مطابق اس قسم کے سوالات کہ تم کون ہو؟ تم کہاں سے آئے ہو؟ تم کہاں جاؤ گے؟ تمہیں کیا کرنا ہے؟ کائنات کی حیثیت کیا ہے؟ تخلیق کے عمل کی حیثیت کیا ہے؟ وغیرہ....ان سب سوالات کے جوابات عقل استقرائی اور عقل استخراجی کی مدد سے دیے جاسکتے ہیں۔

## تحریک رومانویت کی علمیات

تحریک تنویر کے برعکس تحریک رومانویت (Romanticism) یہ قرار دیتی ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ عقل استقرائی اور عقل استخراجی نہیں ہے بلکہ وجدان (Intuition) ہے۔Intuition لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب 'دیکھنا' ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ تحریک تنویر کے برعکس تحریک رومانویت کے نزدیک حقیقت کو براہِ راست 'دیکھا' جاسکتا ہے اور اس براہِ راست دیکھنے کے ذرائع انسانی جبلتیں، انسانی خواہشات اور احساسات ہیں، یہی وجدان ہے اور کچھ نہیں ہے۔عقلی استقرائی اور عقل استخراجی انسانی جبلتوں، خواہشات اور احساسات کی آلۂ کار (Instrument) ہیں۔تحریک رومانویت نے تحریک تنویر کے برعکس انسانی جبلتوں، خواہشات واحساسات کو بنیادی ذریعۂ علم تصور کیا ہے۔

## بنیادی ذریعۂ علم وجدان ہے

غرض تحریک رومانویت کے مطابق بنیادی ذریعۂ علم Intuition ہے اور عقل خواہشات کی

نوکر ہے(Reason is the Slave of Desire) جیسا کہ بینتھم (Bentham) کہتا ہے (گوکہ وہ رومانوی نہیں تھا) کہ عقل تو دراصل خواہشات کی غلام ہے، وہ توIntuition کی باندی ہے اور اصل میں حقیقت تک رسائی کا ذریعہ Intuition ہے۔خود انسان کے اندر وہ جبلتیں ہیں جن کے ذریعہ وہOntological Reality تک پہنچ سکتا ہے۔

## روسو کے ذریعے تحریکِ تنویر اور تحریکِ رومانویت کا ادغام

سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اس دوسرے فلسفہ کا سب سے زیادہ اثر ہوا۔جس شخص نے تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کا باہم ملا دیا وہ روسو تھا۔ روسو کے ہاں ایک بڑا بنیادی تصور ارادۂ عمومی (General Will) کا ہے۔روسو کے خیال میں انسان بنیادی طور پر خیر ہے اور ہمیشہ خیر کا طالب ہوتا ہے۔انسانی خواہشات،جبلتیں اور احساسات فطرتاً پاک ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کے تحت جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ عمومی فلاح ہے۔

انسان خود بخود، بغیر کسی وحی کے، بغیر کسی رہنمائی، بغیر کسی نظام اطاعت کے، بذات خود اس چیز کا مکلّف ہے کہ وہ ارادۂ عمومی کے ذریعہ خیر کا تمنائی ہو۔ ہر فرد کا ارادہ، ارادۂ عمومی کا اظہار اس لیے ہے کہ ہر فرد بنیادی طور پر خیر ہے۔ ارادۂ عمومی کا یہی تصور جمہوریت اور سرمایہ داری کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جمہوریت اور سرمایہ داری کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ "General Will always wills human welfare" یعنی'ارادۂ عمومی ہمیشہ انسانی فلاح کا ارادہ کرتا ہے'

مقصد یہ کہ انسان کا عمومی ارادہ خیر ہے۔ وہ اس بات پر مجبور بھی ہے اور اس کا تمنائی بھی کہ جس چیز کا وہ ارادہ کرے وہ ایسی ہو جس میں سب لوگوں کی بھلائی اور فلاح ہو۔ ارادۂ عمومی فی نفسہٖ خیر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ "The Self is essentially good" یعنی''انسانی ذات فی نفسہٖ خیر ہے۔''

انسانی Self فی الواقع خیر کا ادراک کرتا ہے اور ارادہ بھی خیر کا کرتا ہے۔تحریک رومانویت کے نزدیک انسانی نفس بنیادی طور پر خیر کا منبع ہے۔اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خیر کے ادراک اور خیر پر عمل پیرا ہونے کے لیے وحی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

### انسان اور خدا میں کوئی فرق نہیں

تحریک تنویر میں تو شروع ہی سے یہ تصور موجود ہے کہ انسان اور خدا میں دراصل بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ اس خیال کو مختلف سطحوں پر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ 'سارتر' کے افکار میں سب سے زیادہ یہ بات واضح ہے۔ عموماً بیسویں صدی میں یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے لیکن شروع سے ہی یہ خیال کہ انسان علم و عمل، معاشرت و سیاست کسی شعبہ میں بھی دوسرے کا محتاج نہیں ہے۔ آزادی (Freedom) اور خودمختاری (Autonomy) کے تصور کی یہی بنیاد ہے اور یہ دونوں تصورات تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کی مشترکہ میراث ہیں۔

مغربی تہذیب میں انسان کے قائم بالذات ہونے کا یہی تصور ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اسی لیے ہم مغربی تہذیب کو ایک مکمل اور بدترین گمراہی سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی بقائے باہمی کے قائل نہیں ہیں۔ ہم اسے مکمل طور پر رد کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مغرب کے پاس ایک تصورِ حق و خیر ہے اور ہمارے پاس ایک دوسرا تصورِ حق و خیر اور اس بنیاد پر اسلام اور مغرب میں کوئی مکالمہ ہوسکتا ہے۔ مغرب سے کسی مکالمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.... اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا تصورِ خیر اور تصورِ حق صریحاً باطل ہے۔

### مغرب کا بنیادی عقیدہ الوہیتِ انسان

مغرب کا بنیادی عقیدہ الوہیت انسان کا عقیدہ ہے۔ مغرب کا بنیادی کلمہ لا الٰہ الا الانسان ہے اور اگر بنیادی کلمہ لا الہ الا الانسان ہے تو مغرب اور ہمارے درمیان مکالمہ ممکن ہی نہیں۔ اس بنیادی فرق کے باعث ہمارے اور مغرب کے درمیان تو بُعد المشرقین ہے۔ ہم مغرب کو خالص جہالت تصور کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے مغربی تہذیب وحی کا انکار کرتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وحی الٰہی کے بغیر (عقل اور جبلتوں کی بنیاد پر) حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔ یہ مغرب کا بنیادی عقیدہ ہے اور اسی عقیدہ کے سبب مغرب، مغرب ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تفصیل چند مغربی فلاسفہ کی فکر کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے 'کانٹ' کے چند اساسی نظریات پیش خدمت ہیں:

## کانٹ کا مغربی فلسفے میں مقام

کانٹ مغربی تہذیب میں بہت ہی بنیادی فلسفی ہے۔کانٹ کا مغربی فلسفہ میں جو مقام ہے، افلاطون کے بعد شاید ہی کسی اور مفکر کا ہو۔کانٹ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ Self یا انسانی ذات کے اندر ہی ایسا نظام اور ترتیب (Order) موجود ہے جو انسانی تجربے کو ہیئت (Form) اور ساخت (Structure) فراہم کرتا ہے اور نتیجتاً انسانی تجربہ کو بحیثیت تجربہ کے ممکن بناتا ہے۔ذات یا Self کے اس اندرونی نظام کے بغیر تجربہ ممکن نہیں ہوگا۔ ہم محض مختلف قسم کے غیر مربوط احساسات کے مجموعہ کے مالک ہوں گے۔اسی طرح Self کا یہ Order کائنات کو اور اس میں موجود مختلف اعمال و افعال اور اشیاء کو معانی فراہم کرتا ہے۔کائنات کے اپنے اندر کوئی معانی نہیں ہیں، جب Self کے Order کو کائنات پر مسلط کیا جاتا ہے تو اس کے اندر معانی بھی پیدا ہوتے ہیں اور مختلف احساسات و معطیات باہم مربوط ہو کر تجربہ (Experience) کو اگر کائنات پر مسلط کیا جائے تو کائنات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے جیسا کہ اس کو سمجھنا چاہیے۔یعنی کائنات کو ایک معقول (Rational) کائنات کے طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو Self کے نظام (Order) کے ذریعے سمجھا جائے۔تعقل، معانی، ربط وضبط، نظام، معیشت کا منبع و مصدر انسانی ذات (Self) ہے، اس منبع نور کے باہر کائنات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، اور بے ربطی ہے۔

The Self possessos an order which determines the structure of experience, gives forms and meaning to the world.

## اشیاء کا مادی وجود لازمی ہے

کانٹ کے مطابق Self کو ایک ایسا علم حاصل ہے جو تجربہ سے ماورا ہے۔(Aprior Knowledge)۔ان معنوں میں ماوراء ہے کہ تجربہ کو تجربہ بننے کے لیے اس ماورائی علم میں شرکت کرنا پڑتی ہے ورنہ تجربہ، تجربہ نہ بن سکے گا اور محض بے ربط احساسات اور معطیات کا ایک مجموعہ (Bundle) رہے گا۔الغرض کانٹ کے مطابق Self ایک ایسا علم رکھتا ہے جس میں شے (Thing) کے تصورات (Categories) اور اشیاء کے مابین تعلق (Relation) کے متعلق تصورات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔مثلاً علت اور نتائج (Causation) کے تصورات اشیاء کے درمیان ربط و تعلق کے بارے میں وہ اطلاع دیتے ہیں (اور یہ اطلاع Self کے پاس موجود

ہے) جس کے ساتھ کائنات کی ہر چیز کو ہم آہنگ ہونا پڑے گا ورنہ وہ علم اور تجربہ نہیں بن سکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کائنات میں کسی بھی دو یا اس سے زیادہ اشیاء کے درمیان تعلق متصور ہو اور وہ ان تصورات سے ماوراء ہو جو تصورات Self میں پہلے سے موجود ہیں۔ اسی طرح کائنات میں کوئی چیز بھی ان تصورات سے ماوراء نہیں ہوسکتی جو Self میں پہلے سے موجود ہیں۔ مثلاً ایک ایسا تصور، تصورِ مکاں (Space) ہے، ایسا ہی ایک تصور تصورِ زمان (Time) ہے، نیز ایسا ہی ایک تصور تصورِ مقدار (Quantity) ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شے ہو اور وہ زمان اور مکان میں نہ ہو، یا اس کی کوئی مقدار نہ ہو۔ یہ قطعاً ممکن نہیں ہے ورنہ وہ شے ہمارے احاطۂ علم میں ہی نہیں آئے گی اور اس کا ہونا نہ ہونا برابر قرار پائے گا۔

## کانٹ اور عرفان ذات

الغرض کانٹ نے ایک طرف تو یہ کہا کہ عقلیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ Self کے اندر وہ ترتیب اور نظم (Order) موجود ہے جس کے نتیجے میں اشیاء اور اس کے باہمی ربط و تعلق کو متصور (Conceptualise) کرنے کے لیے ضروری تصورات کا Self کو پہلے سے علم ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ Self خود کیا ہے تو اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ کانٹ کی علمیات میں عرفانِ ذات کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ Self جانتا ہے اور جاننے کا ذریعہ ہے لیکن Self خود کیا ہے یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ ہمیں جس چیز پر ایمان لانا چاہیے اور اعتقاد رکھنا چاہیے وہ Self کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ جان سکتا ہے، علم (Knowledge) تک رسائی حاصل کرسکتا اور اپنے اندر ان تصورات اور اس ترتیب و نظم کو سموئے ہوئے ہے جو علم کو ممکن بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ اس سب پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یہی آزادی (Freedom) پر ایمان ہے۔ فریڈم یا آزادی کیا ہے؟۔ آزادی Self کی اس استطاعت (Capacity) کا نام ہے کہ وہ تمام تصورات کو جان سکے جن پر تجربہ اور علم کی بنیاد ہے۔ لیکن Self کی اس صلاحیت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایمان اور عقیدے کی بات ہے۔ عقل استخراجی اور عقل استقرائی کسی میں بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ Self کی اس صلاحیت کو ثابت کرسکے۔ یہ تو ایمان کی بات ہے۔ آپ کو اس پر ایمان لانا پڑے گا کہ Self کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ آپ اس کی بنیاد پر دنیا اور اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکیں۔

## عقل کی بنیاد پر زبان ومکان سے ماوراء قوانین ایجاد کیے جاسکتے ہیں

Self کی اس صلاحیت پر ایمان لانے کے بعد ہم ایسے عمومی اصول وضع کر سکتے ہیں اور ایسے قوانین بنا سکتے ہیں جو آفاقی ہوں۔ ہم عقل استقرائی اور عقل استخراجی کو استعمال کر کے ایسے اصول وضع کر سکتے ہیں جو مجموعی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو کسی شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً کسی ایسے قانون کی ضرورت نہیں ہے جس کی دلیل کتاب اللہ سے نکلتی ہو یا انجیل سے نکلتی ہو، وغیرہ۔ ہم خود اپنی اپنی عقل کی بنیاد پر ایسے قوانین ایجاد کر سکتے ہیں جو ہر معاشرہ، ریاست اور ہر نظام میں مجموعی طور پر نافذ کیے جاسکتے ہوں اور جس کے نتیجہ میں ایک عادلانہ معاشرہ، ایک عادلانہ ریاست اور ایک عادلانہ تنظیم ممکن ہو سکے۔ چنانچہ ہمیں کسی کتاب اللہ کی ضرورت نہیں، ہمیں کسی شریعت کی ضرورت نہیں، ہمیں کسی ہدایت کی ضرورت نہیں، محض عقل کے استعمال سے ہم وہ قوانین بنا سکتے ہیں جو آفاقی ہوں۔

## مثالی معاشرے کا تصور

اگر ہم ان آفاقی اصولوں پر عمل کریں تو ہم ایک ایسا مثالی (Ideal) معاشرہ قائم کر سکتے ہیں جسے کانٹ Kingdom of Ends کہتا ہے۔ Kingdom of Ends سے مراد ریاست ہے جہاں ہر فرد کا یہ اختیار تسلیم کیا جائے کہ وہ خود مختار (Autonomous) اور قائم بالذات ہے۔ جہاں ہر شخص اس بات کا تعین کرے کہ وہ کس قسم کی زندگی گزارے گا۔ جہاں ہر شخص کو مقصود بالذات سمجھا جائے۔ ہر شخص کو مساوی خود مختار، مساوی طور پر قائم بالذات ہونا اور مساوی طور پر مقصود بالذات ہونا تسلیم کیا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ شخص خیر وشر کا تعین خود کر سکتا ہے۔ یہی کانٹ کا مثالی اور عادلانہ معاشرہ ہے۔ یہی اس کے فکر میں جنت ارضی کا تصور ہے۔ کانٹ نے اس جنت ارضی کا تصور براہ راست عیسائی جنت سماوی (Kingdom of Heaven) کی تردید اور متبادل کے طور پر پیش کیا تھا۔

کانٹ کے افکار کے اجمالی جائزے سے ظاہر ہے کہ اس کے تمام افکار جن پر پوری مغربی تہذیب کھڑی ہے اور مغربی فکر وفلسفہ کا انحصار ہے، مطلقاً طاغوت ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عیسائیت کے ساتھ کانٹ کا ایک نوعیت کا تعلق ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نزدیک وہ ترتیب اور نظم (Order) Self کے اندر خدا نے ہی رکھا ہے وغیرہ۔ کانٹ اس کا انکار نہیں کرتا۔ اس کی

کچھ توجیہات ہیں جس کی بنیاد پر کانٹ کو خاص طور پر پروٹیسٹنٹ عیسائی بنیادوں پر جواز مل سکتا ہے۔لیکن عملاً جس چیز کی وہ تعلیم دیتا ہے اور جو چیز عام ہوئی ہے وہ یہی خودارادیت کی تعلیم ہے۔ اس چیز کی تعلیم ہے کہ قانون بھی آپ خود بنا سکتے ہیں اور ماورائے کائنات حقائق کا ادراک آپ خود کر سکتے ہیں۔وہ خود عیسائی رہا ہوگا لیکن جس چیز کی اس نے ترویج واشاعت کی وہ تو خالص کفر تھا اور اسی کفر کی بنیاد پر سرمایہ داری اور جمہوریت قائم ہے۔آزادی کا یہ تصور ہی بعد میں سرمائے کی شکل اختیار کرتا ہے اور عالمی گمراہی کے طور پر مقبول ہوتا ہے۔

## ہیگل کا تصورذات....اجتماعی

دوسرا اہم مفکر ہیگل ہے۔ہیگل اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کا فلسفی ہے۔ہیگل کے تصورات بھی ان معنوں میں بہت اہم ہیں کہ ان کا یورپی فکر پر بہت اثر ہوا ہے۔ہیگل اور کانٹ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کانٹ کا تصورِذات (Self) انفرادی ہے۔جبکہ ہیگل کا تصورِ ذات اجتماعی ہے۔ ہیگل کے نزدیک زبان کی بنیاد پر قائم تاریخی اجتماعیت (Historical Language Community) کے تناظر اور سیاق وسباق میں انفرادی Self کی تشکیل ہوتی ہے۔اس تناظر کے علی الرغم (Self) کے کسی تصور کو مقصود کرنا محض ایک خام خیالی اور Abstraction ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل Self جو قائم وہ موجود ہے اور اجتماعیت پر مبنی Self ہے اور فرد کا کام اس Self میں شریک ہونا ہے۔مثلاً جرمن قوم کا Self اصل میں موجود ہے۔ اور یہ Self جرمن تاریخ،جرمن تہذیب اور جرمن تاریخی تجربہ (Historical Experience) میں اپنا اظہار کرتا ہے۔

## ہیگل کے یہاں Self کا تیسرا تصور

لیکن ہیگل کے یہاں انفرادی اور اجتماعی Self کے علاوہ Self کا ایک تیسرا تصور بھی ہے جسے وہ ذات مطلق (Absolute Self) کہتا ہے۔ اسی ذات مطلق کو وہ روح کائنات (Geist) بھی کہتا ہے اور دوسرے نام بھی ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ہیگل نے ذات مطلق کا تصور مذاہب،خصوصاً عیسائیت سے لیا ہے اور اسی لیے بعض لوگ اسے عیسائی مفکر بھی سمجھتے ہیں لیکن ہیگل کے 'ذات مطلق' اور عیسائیت کے 'تصورِخدا' میں ایک بہت بنیادی فرق ہے۔عیسائی مذہب اور مذاہب کے نزدیک خدا ازل سے اپنی مکمل صورت میں موجود ہے اور

اس نے کائنات کو عدم سے تخلیق کیا ہے۔ خدا زمان و مکان سے ان معنوں میں بالا ہے کہ اس کی ذات وصفات میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے، لیکن ہیگل یہ کہتا ہے کہ ذات مطلق کہیں بھی مکمل صورت میں موجود نہیں ہے۔ ذات مطلق محض ایک مجرد تصور ہے۔ لیکن جب یہ ذات مطلق زمان و مکان میں داخل ہوتی ہے تو یہ مجرد تصور.... ایک عملی شکل (Actualization) حاصل کرتا ہے۔ تاریخ اس ذات مطلق کی خود تخلیقیت (Self Creation) اور خود تشکیلیت (Self Constitution) کا سفر ہے۔ جب ذات مطلق خود تخلیقیت کے اس عمل کے ذریعہ اپنے آپ کو مکمل کرے گی تو تاریخ ختم ہو جائے گی۔ اسی کو ہیگل اختتام تاریخ (End of History) کہتا ہے۔ اگر مذہبی زبان میں اس بات کو بیان کریں تو ہیگل کے نزدیک (نعوذ باللہ، ثم نعوذ باللہ) خدا تاریخ کے ذریعے اپنے آپ کو خلق کر رہا ہے اور اپنے آپ کو مکمل کرنے کے عمل میں ہے۔

## ہیگل نپولین کو خدا کا اظہار سمجھتا تھا

اب ہیگل کے نزدیک ذات مطلق خود تخلیقیت اور خود تشکیلیت کے اس سفر کو زبان کی بنیاد پر قائم تاریخی اجتماعیتوں اور ان تاریخی اجتماعیتوں کے جلو میں ظہور پذیر ہونے والی نابغۂ روزگار شخصیات کے ذریعہ کرتی ہے۔ مثلاً جرمن قوم کی تاریخ، تہذیب، ادارے ذاتِ مطلق کی تکمیل سفر کے مختلف لمحات ہیں۔ اسی طرح مثلاً نپولین کو ہیگل فی الواقع خدا کا اظہار سمجھتا تھا۔ اور ۱۸۰۶ء میں جب نپولین نے جرمنی پر حملہ کیا تو ہیگل نے باوجود اس کے کہ وہ جرمن تھا، اس کا خیر مقدم خدائی تعظیم کے ساتھ کیا اور اپنی کتاب Phenomenology of Self اس کے نام معنون کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہیگل کے نزدیک نپولین ذاتِ مطلق کا اظہار تھا۔ تو انفرادی Self اور اجتماعی Self دونوں ذاتِ مطلق کی خود تخلیقیت اور خود تشکیلیت کے عملی آلۂ کار (Vehicle) ہیں۔ اسی کو ہیگل عقل کی مکاری (Cunning of Reason) اور تاریخ کی مکاری (Cunning of History) کہتا ہے۔

## تاریخ خیر و شر کا اصل پیمانہ ہے

ان دونوں اعمال (Processes) یعنی (Cunning of Reason) اور (Cunning of History) کے ذریعہ تاریخی اجتماعیتیں حق کے اظہار پر مجبور ہیں۔ چنانچہ

تاریخی اجتماعیتوں کی تاریخ، طرز حیات ہی خیر وشر اور اخلاقیات کے پیمانے ہیں۔ اخلاقیات وہ نہیں ہے جو انجیل اور قرآن میں لکھی ہے، بلکہ اخلاقیات سے مراد یہ ہے کہ تاریخی اجتماعیت نے ارتقاء (Development) کے لیے جو معیارات خیر وشر مقرر کیے ہیں، انہی سے اخلاقی معیارات اور پیمانے تشکیل پاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں قرآن اور انجیل اخلاقیات کے پیمانے فراہم کرتے ہوں لیکن کیونکہ وہ اپنے زمانے کی تاریخی اجتماعیتوں کی اخلاقیات کے اظہار تھے، اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور اجتماعیتوں نے اخلاقیات کے اظہار کے جو نئے زینے عبور کیے ہیں انہوں نے قرآن اور انجیل کو ازکارِ رفتہ شے بنا کر رکھ دیا ہے۔

## تاریخ میں اخلاقی پیمانے بدلتے رہتے ہیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں تغیرات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیمانے، خیر وشر کے معیارات بدلتے رہتے ہیں اور ہر آنے والا وقت پہلے سے بہتر ہے اور اس کے پیمانے پہلے دور کے مقابلے میں فوقیت رکھتے ہیں اور ہر آنے والے دور میں ذات مطلق اپنی تخلیق اور تکمیل کے اگلے اور برتر مرحلے میں داخل ہوچکی ہوتی ہے۔ اسی کا نام ترقی (Progress) اور Development ہے۔

## خیر وشر کا پیمانہ ترقی ہے

اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ ہیگل کے نزدیک خیر وشر کا جو پیمانہ ہے وہ ترقی (Development) ہی ہے اور جو تاریخی اجتماعیت جتنی زیادہ ترقی کر گئی وہ اسی قدر معیار حق و باطل اور معیار خیر وشر ہوگی اور چونکہ سب سے زیادہ ترقی جس اجتماعیت (Community) نے کی ہے، اور سب سے زیادہ غلبہ جس نے حاصل کیا ہے وہ مغرب ہے اس لیے مغرب اور اس کی تاریخ اور تہذیب، ادارتی صف بندی، آدرشیں ہی حق و باطل کا معیار ہیں۔ اور چونکہ مغرب کی ترقی کے آگے کسی ترقی کا تصور نہیں ہوسکتا اس لیے مغربی تہذیب ہی بنیادی طور پر ذاتِ مطلق اور روح کائنات کا مکمل اظہارِ ہے۔ اسی لیے مغربی تہذیب کا غلبہ تکمیلِ ذات مطلق ہے اور اسی لیے اب دائمی ہے اور اس دوام کو کبھی زوال نہیں آئے گا اس لیے ہر تہذیب اور ملت کو مغرب کی تہذیب، آدرشوں، اداروں کو خیر مطلق کی حیثیت سے قبول کر لینا چاہیے۔ ان معنوں میں تاریخ

اب ختم ہوگئی ہے۔

### ہیگل امریکا کا سب سے بڑا مداح ہے

اور اسی لیے سب سے زیادہ توقع اور امید اور سب سے زیادہ مدح سرائی ہیگل کے ہاں امریکہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے اصل میں امریکہ مغربی تہذیب کی روح کا خالص ترین اظہار ہے۔ حالانکہ ہیگل کے دور میں امریکہ کی کوئی خاص سیاسی حیثیت نہیں تھی جو آج ہے، اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کے آدرشوں اور افکار کے سب سے زیادہ اظہار اور سب سے زیادہ ترقی کا امکان امریکہ میں ہے۔

### تاریخ کے خاتمے کا مطلب کیا ہے؟

الغرض مغربی تہذیب کا غلبہ دائمی ہے۔ جب مغرب میں یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کا خاتمہ ہو چکا ہے تو وہ ان معنوں میں کہ اس کے بعد کسی بنیادی تغیر کا امکان ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد حق کے مزید کسی ادراک کا کوئی امکان نہیں ہے۔ فی الواقع تحریک تنویر نے جو تصورات پیش کیے ہیں بالخصوص آزادی کا تصور، وہ قدر مطلق ہے اور اس قدر مطلق کو آفاقی طور پر مستحکم کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ مغربی تہذیب کی عالمگیریت اور آفاقیت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا جائے بلکہ اس کو ممکن بھی بنایا جائے اور اس کی راہ میں حائل ہر خطرے کو ہر قیمت پر ختم کر دیا جائے۔

مغرب ایک دنیا تعمیر کر رہا ہے، یہ دنیا قابل تغیر اور نا قابل تردید ہے۔ تاریخ کا اختتام ان معنوں میں ہو چکا ہے کہ مغربی تہذیب نے جن آدرشوں کو پیش کیا ہے انہیں نہ صرف یہ کہ آفاقی حق کے طور پر قبول کرے گی بلکہ اس کے اظہار کا موقع بھی دے گی۔ مغربی تہذیب کا غلبہ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ تحریک تنویر اور تحریک رومانویت نے جن آفاقی نظریات کو پیش کیا تھا ان کے سامنے بند باندھنا ممکن نہیں ہے۔

جنہوں نے ہیگل کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ہیگل کی رومانوی اور تنویری تعبیریں یکساں طور پر ممکن ہیں۔ اور روسو کی طرح ہیگل بھی تہذیب مغرب کے ان دو دھاروں کے ملاپ کا کام کرتا ہے۔ (جاری ہے)

CPL No. 296 June 2021

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

# خاموش انقلاب ناگزیر ہے

ریاست اگر ساتھ نہ بھی دے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی
میں اسّی فیصد سے زیادہ اسلام پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صفحات ۲۸۸ قیمت ۲۵۰ روپے

**مکتبہ البرہان**

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com